شمارہ
۲۲
۱۶/ستمبر تا ۳۰/ستمبر ۲۰۲۶ء

پندرہ روزہ

آن لائن

اُردو گلبن (جدہ)

(خالص ادبی و معاشرتی رسالہ)

ہم نے خوشبو کے بند کھول دیئے
اب ہوا تیری ذمہ داری ہے

مدیر اعلیٰ: مہتاب قدر

پندرہ روزہ

اُردو گلبن

(خالص ادبی و معاشرتی رسالہ)

مجلس ادارت

پروفیسر ارتضٰی کریم

مہتاب قدر

مرزا محمد نواب

افسر حسین

اسلم افغانی

تاشقین سیّد

فیصل طفیل

مجلس مشاورت

نعیم جاوید	(دمام الخبر)
افتخار راغب	(ریاض)
محمد سیف الدین	(ریاض)
ناصر برنی	(ینبع)
سراج وہاب	(جدہ)
افسر فہیم	(امریکہ)
دانش عبدالغفور	(ریاض)
مسعود حساس	(کویت)
عزیز الرب علیگ	(جدہ)
اعجاز شاہین	(امارات)

اشاعت کی شرائط

۱۔ مضمون زبان و بیان کے اعتبار سے مبہم اور پیچیدہ نہ ہو۔

۲۔ مضمون کا زیادہ تر مواد ماخوذ و مستفاد نہ ہو اور حوالے ساتھ نقل کیے جائیں۔

۳۔ مضمون میں موضوع سے متعلق کما حقہ احاطہ کیا گیا ہو۔

۴۔ اقتباسات/ اشعار ضرورت سے زیادہ نہ ہوں، مضمون نگار کی اپنی تحریر زیادہ ہو۔

۵۔ مضمون رسالہ کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو؛ یعنی تحریر سے کسی کی دل آزاری یا ہجو مقصود نہ ہو۔

۶۔ مضمون میں ترجیحاً کوئی نیا زاویہ یا نئی جہت ہونی چاہیے۔

۷۔ مضمون نہایت مختصر یا بہت طویل نہ ہو۔

۸۔ مضمون نگار اپنی پاسپورٹ سائز تصویر، پورا پتہ، اور مراسلت کے لیے ای میل و فون نمبر بھی ارسال فرمائیں۔

مہتاب قدر

مدیر اعلیٰ

Email: mahtabqadr@gmail.com

Whatsapp: +966 50 132 9193

مرزا محمد نواب

Email: mirza_shanov@hotmail.com

Whatsapp: +966 50 8509457

تزئین کار محمد سلیمان طاہر

توجہ طلب: پندرہ روزہ آن لائن اُردو گلبن رسالے میں شائع ہونے والے تمام مضامین قلم کاروں کے اپنے ذاتی خیالات ہیں اور وہ خود ان کے ذمہ دار، کسی بھی تحریر سے کسی کی تضحیک یا ہجو منظور نہیں اور یہ مطلق ضروری نہیں کہ ادارہ اُردو گلبن قلم کاروں کی نگارشات سے اتفاق کرے۔

حُسنِ ترتیب

قرآنی آیت		4
حدیث نبوی (ﷺ)		4
اداریہ: ''اٹھو کہ آج حق محبت ادا کریں''	مہتاب قدر (جدہ)	5
مناجات ''مجھ کو ایمان کی دولت سے تونگر کردے''	طاہر سلطانی (کراچی)	6
حمد باری تعالیٰ: ''حمد ہے اس ذاتِ سبحاں کے لیے''	بہزاد لکھنوی (کراچی)	6
نعت رسول ﷺ: ''تجھے گر دین و دنیا کے سکھانے آپ آئے ہیں''	ڈاکٹر رؤف خیر (حیدرآباد)	6
نعت رسول ﷺ: ''مل جائے خاکِ دل کو طہارت کا پیرہن''	ڈاکٹر شمس الدین حامد ناگپوری	7
نعت رسول ﷺ: ''تاریک زمانے کو ضیا آپ نے دی ہے''	احمد شاذ قادری (پٹنہ)	7

(افسانہ/انشائیہ)

زندگی اور ہم (افسانہ)	غزالہ تبسم	8
فرشتوں کو بھی میسر نہیں شاعر ہونا (انشائیہ)	ڈاکٹر جاوید کمال (حیدرآباد)	11
بہادر بلّو (کہانی)	فرخندہ ضمیر	13

(غزلیں)

نرم سی بیل سہارا تو نہیں ہو سکتی	شاہین فصیح ربانی	16
پرانے زخم پر جگنو صفت آنسو بہاتا ہوں	طاہر سعود کرت پوری	16
سپردِ باد کریں ہم چراغِ جاں کب تک	تاشفین سید (جدہ)	16
ہر اک سے بے خبر دنیا سے بیگانہ بنایا ہے	ارشد قدوائی (جدہ)	17
جو نہاں رکھتا ہوں دل میں وہ عیاں کرتا ہوں دل میں	حسن امام فدائی (جھارکھنڈ)	17
ہر ایک موڑ پہ رُسوا شباب ہوتا ہے	ظہیر آتش	17

(مضامین)

اُردو زبان کی ترویج و ترقی مولوی عبدالحق کی خدمات کے تناظر میں	مقسط احمد (مہاراشٹر)	18
بچوں کے ادب میں طنز و مزاح کی روایت	کلدیپ آنند (نئی دہلی)	22
تبصرہ: افسانوی مجموعہ ''تلخیاں زندگی کی'': ایک طائرانہ نظر	ڈاکٹر سعدیہ سلیم شمسی (آگرہ)	30
تبصرۂ کتب: معروف قلمکار و ادیب محمد اشفاق بدایونی کی تیسری کتاب ''مثال کے طور پر''		33

(شخصیات)

قلم قافلہ: پروفیسر عائشہ محمد طارق شیخ		34

(خبریں)

لفظوں کی خوشبو، آوازوں کا سفر۔ آن لائن عالمی خواتین مشاعرہ	ڈاکٹر رفیعہ نوشین (حیدرآباد)	35
سید اکبر الدین کا تقرر	مرزا محمد نواب (جدہ)	36
مہتاب صاحب کو کارنامۂ حیات ایوارڈ	(ادارہ)	37
اُردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والی حنا قاسم پھول پنکر کی کامیابی	(ادارہ)	37
سانحۂ ارتحال: ندیم صاحب کا انتقال	شہید احمد (جدہ)	38
سانحۂ ارتحال: شفیع الحق انتقال کر گئے	(ادارہ)	39

(آپ کے خطوط)

خط ۱	ابوفرح (جدہ)	40
خط ۲	ارشد قدوائی (جدہ)	40
خط ۳	انیس احمد صدیقی (ممبئی)	40
خط ۴	یاسمین اختر طوبیٰ (گوجرہ۔ پاکستان)	40
خط ۵	محمد ابوبکر مونگیر (ہندوستان)	40

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

قرآنی آیت

وَقَضٰی رَبُّكَ أَلَّا تَعۡبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ إِحۡسَانًا

(ال إسراء:23)

(ترجمہ: اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو)

حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

رِضَا الرَّبِّ فِي رِضَا الۡوَالِدِ، وَسُخۡطُ الرَّبِّ فِي سُخۡطِ الۡوَالِدِ (ترمذی)

(ترجمہ: رب کی رضا والد کی رضا میں ہے، اور رب کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے)

شعر

مجھ کو تھکنے نہیں دیتا یہ ضرورت کا پہاڑ
میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے

(معراج فیض آبادی)

اُٹھو کہ آج حقِ محبت ادا کریں

اداریہ

ماہِ ربیع الاوّل دبے قدموں وقت کی دہلیز سے گزر کر اپنی بابرکت نورانی شمعیں روشن کر چکا ہے۔ تاریخ کے اوراق میں آپ ﷺ کی پیدائش مختلف روایات میں 9 یا 11 اور 12 ربیع الاوّل ذکر کی گئیں، علماء جمہور کے نزدیک 12 زیادہ مستند ہے۔

بعض روایتوں کے مطابق اس زمانے میں دُنیا کے بڑے سیاسی مراکز میں رومی (بازنطینی) اور ساسانی (فارس) سلطنتیں نمایاں تھیں جبکہ عرب میں دُوسری طرف قبائلی نظام غالب تھا اور مکہ مذہبی وتجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، روایات کے بموجب حضور ﷺ کی پیدائش کے دن کسریٰ کے محل کے چودہ کنگرے گر گئے۔

اور بعض کتبِ سیرت میں روایت ملتی ہے کہ ولادتِ نبوی ﷺ کے موقع پر فارس کا مقدس آتش کدہ بجھ گیا۔ گویا کفر وشرک کے مراکز لرزہ براندام ہوگئے کہ وہ تشریف لا چکے جن کی آمد باطل کے لئے خوش کن خبر نہ تھی۔ پھر دُنیا نے دیکھا کہ صرف تیرہ برس کی جدوجہد کے بعد جو دراصل اسلام میں داخل ہونے والوں کے لئے آزمائش اور تربیت کا زمانہ تھا، اس کے بعد صرف دس سال میں وہ فتوحات ہوئیں کہ دُنیا نے آپ رحمت اللعالمین ﷺ کی ذاتِ بابرکات کی تمام تر پالیسیوں کا لوہا مان لیا۔ ایک طرف خوش خلقی کا یہ عالم کہ اپنی جان کے دشمنوں کو بھی معاف کر دیا اور دُوسری طرف بغاوت کرنے والوں کے لئے فوجی دستے بھیج کر سرکوبی فرمائی۔ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو عام معافی کا اعلان فرمایا۔ جنگیں صرف ان سے لڑیں جو لڑنا چاہتے تھے اور اپنے تئیں خوش فہمیوں میں مبتلا تھے۔ کمزوروں عورتوں اور بچوں کو مارنے کی قطعی ممانعت فرمائی۔ ایسے عظیم سپہ سالار کے ماننے والے اپنی ہی قوم پر ظلم کرتے نہیں تھکتے۔ آپ ﷺ نے تو تمام انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی۔ کاش ہم سیرت پڑھتے اور اس سے سیکھتے!!

بے شک ہمیں اور ہر ایمان والے کو آپ ﷺ سے محبت ہے مگر کیا محبت کے یہی تقاضے ہیں کہ آپ کے لائے ہوئے دین کو ہم غیروں میں تو کیا ترغیب وتبلیغ کی کوشش کرتے، خود اپنے آپ پر نافذ کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ کیا یہی مطالبہ ہے حبِ رسول ﷺ کا کہ جشنِ ولادت تو خوب زور وشور سے منائیں اور اپنی روزمرّہ زندگی میں اُسوۂ حسنہ کو قریب بھی نہ آنے دیں۔

کافی نہیں کہ بیٹھ کے مدح وثناء کریں
اُٹھو کہ آج حقِ محبت ادا کریں

مہتاب قدر
(جدّہ)

مناجات

طاہر سلطانی

(کراچی)

مجھ کو ایمان کی دولت سے تونگر کر دے
خیر کی راہ چلوں دُور ہر اِک شر کر دے

بے نواؤں کے ہر اِک درد کو بانٹیں مِل کر
دے کے وُسعت دلِ مسلم کو سمندر کر دے

دینے والا ہے تُو ہی عزّت و ذلّت یارب!
تُو اگر چاہے تو اصغر کو بھی اکبر کر دے

محفلیں حمد کی جو لوگ سجاتے ہیں مدام
زندگی ان کی الٰہی! تُو منوّر کر دے

پرچمِ حمد و ثنا لے کے میں بڑھتا ہی رہوں
حمد اور نعت ہی اب میرا مقدّر کر دے

راہِ حق پر ہی چلے، حمد لکھے، حمد پڑھے
اپنے طاہرؔ کو ذرا حمد کا خوگر کر دے

حمد باری تعالیٰ

بہزاد لکھنوی

(کراچی)

حمد ہے اس ذات سبحاں کے لیے
بخششیں ہیں جس کی ہر جاں کے لیے

رب عالم ہے جو ذات لاشریک
رحمتیں جس کی ہر انساں کے لیے

آنکھ جس کو دیکھ سکتی ہی نہیں
چاہیے دل جس کے عرفاں کے لیے

جو حدود عقل میں آتا نہیں
لابدی جو فکر انساں کے لیے

ذکر جس کا فکر جس کی جس کا نام
وجہ تسکیں قلب گریاں کے لیے

ہر نگاہ آرزو ہے منتظر
جس نگار بزم امکاں کے لیے

حمد اس کی کیا ادا بہزادؔ ہو
ہر صفت ہے جس کی عنواں کے لیے

نعت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

ڈاکٹر رؤف خیر

(حیدر آباد)

تجھے گر دین و دنیا کے سکھانے آپ آئے ہیں
بھٹکتا ہے کدھر تو اے زمانے آپ آئے ہیں

یہ چورا ہے تجھے آخر کہیں کا بھی نہ چھوڑیں گے
یہ منزل ہے ادھر آ اے دوانے آپ آئے ہیں

نبوت اور امامت تا قیامت آپ کا حق ہے
معانی اقتدا کے بھی بتانے آپ آئے ہیں

میں اپنی حد سے واقف ہوں میں اس سرحد سے واقف ہوں
کہا آقا سے رک کر ذوالقوی نے آپ آئے ہیں

جنھیں امی سمجھتے تھے مدینہ علم کا نکلے
پڑھے لکھوں کو بھی کیا کیا پڑھانے آپ آئے ہیں

پڑے ہوں عقل پر پردے تو پھر کچھ کر نہیں سکتے
وگرنہ خیر ہر پردہ اٹھانے آپ آئے ہیں

نعت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ڈاکٹر شمس الدین حامد ناگپوری

مل جائے خاکِ دل کو طہارت کا پیرہن
ہم کو عطا ہو آپؐ کی نسبت کا پیرہن

ویرانۂ حیات میں کھل جائیں پھر گلاب
مل جائے مصطفیٰؐ کی محبت کا پیرہن

مٹی کا ایک ذرّہ تھا، بے نام و بے نشاں
پہنا دیا حضورؐ نے عظمت کا پیرہن

صحرا میں جیسے چشمۂ رحمت رواں ہوا
ویسے ہی دل نے پہنا عنایت کا پیرہن

آنکھوں میں اشکِ شوق، لبوں پر درود ہو
ہر سانس پر ہو عشقِ رسالت کا پیرہن

اخلاقِ احمدی سے منوّر ہو زندگی
کردار کو نصیب ہو سنّت کا پیرہن

جبریلؑ بھی جہاں پہ ادب سے ٹھہر گئے
شب نے وہیں پہن لیا رفعت کا پیرہن

یادِ نبیؐ میں جب بھی تڑپنے لگے یہ دل
ہر درد کو نصیب ہو لذّت کا پیرہن

بے چین رُوح پوچھتی رہتی ہے بار بار
کب مل سکے گا مجھ کو سعادت کا پیرہن

جب نامِ مصطفیٰؐ سے مہکنے لگا وجود
ذرّوں کو مل گیا ہے لطافت کا پیرہن

اَشکوں نے دھو دیا ہے گناہوں کا ہر غبار
آنکھوں کو مل گیا ہے طہارت کا پیرہن

ہر صبح منتظر ہے کہ کب آئے وہ گھڑی
آنکھوں کو جب ملے گا زیارت کا پیرہن

ہر ذرّۂ وجود میں خوشبو ہے آپؐ کی
مٹی نے پہن رکھا ہے نسبت کا پیرہن

جب حشر میں اُٹھے گا مرا بے نوا بدن
حاصل ہو اس کو اذنِ شفاعت کا پیرہن

نعت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

احمد شاذؔ قادری

(پٹنہ)

تاریک زمانے کو ضیا آپ نے دی ہے
وحدت کی صدا دامن بطحا سے اٹھی ہے

پھر ناؤ بھنور میں ہے، پریشان ہے امت
سرکار خبر لیجئے سنکٹ کی گھڑی ہے

کانٹے بھی ملیں گر مجھے پلکوں پہ سجالوں
اس رشک جناں کی تو ہر اک چیز بھلی ہے

جچتا ہی نہیں اس کو لباس گل تازہ
خوشبو مرے آقا کا بدن ڈھونڈ رہی ہے

بیمار محمد کی خبر رکھتی ہے یہ بھی
پھر حال مرا باد صبا پوچھ رہی ہے

اے گنبد خضری ! مجھے بھاتا نہیں کچھ بھی
جب سے تری تصویر نگاہوں میں بسی ہے

آنکھیں ہیں کہ دیدار کی پیاسی ہیں ازل سے
دل ہے کہ اسے عشق میں مٹنے کی پڑی ہے

میں دور ہوں، مجبور ہوں، رنجور ہوں آقا
بلوائیے مجھ کو بھی بڑی آس لگی ہے

پھر آنکھ سے اوجھل ہوئے طیبہ کے مسافر
پھر شاذؔ کے سینے میں وہی ہوک اٹھی ہے

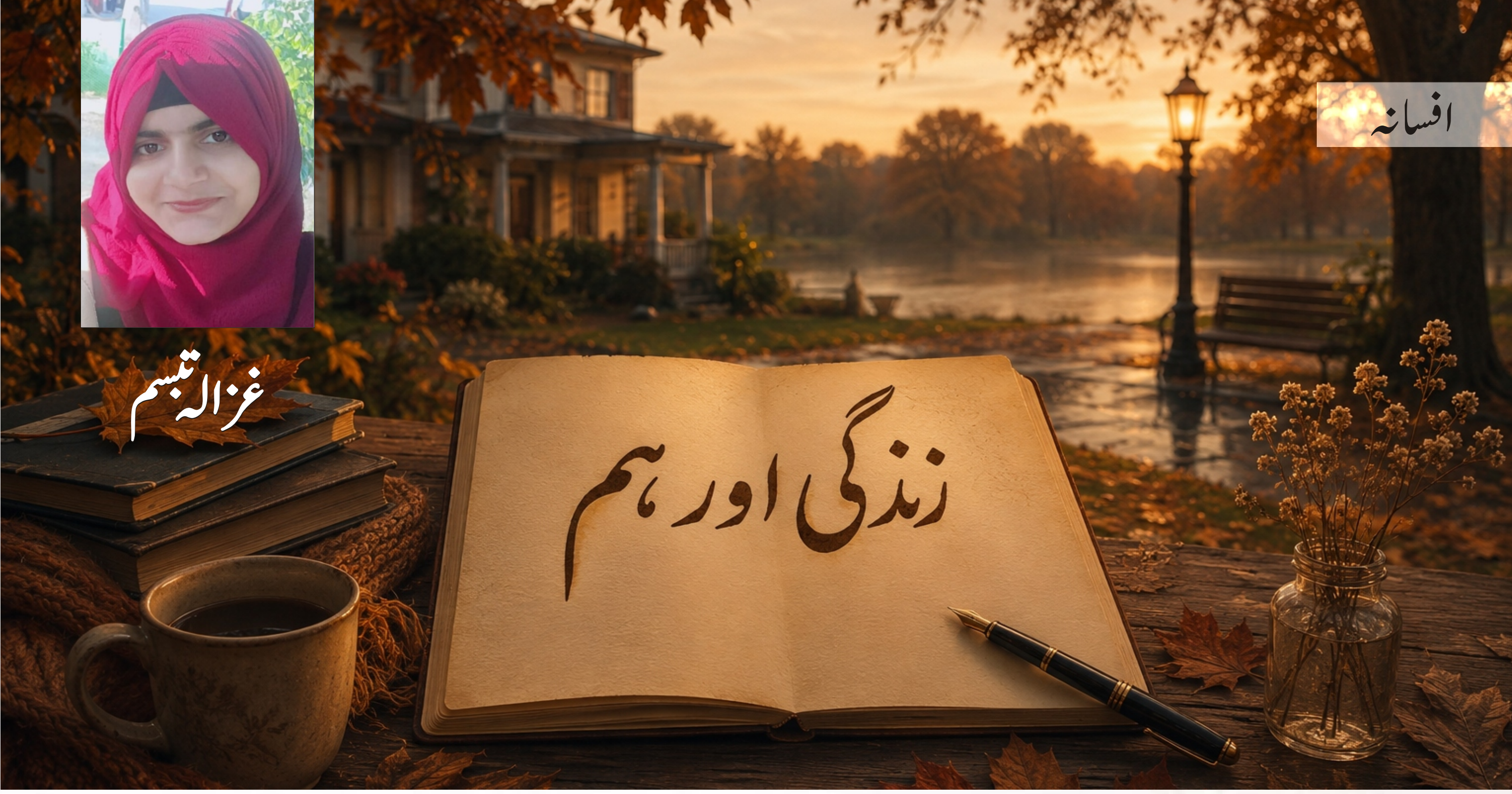

خزاں کی سرد ہوا نے جب کھڑکی کے پتوں کو چھوا، تو عنبرین نے اپنی شال کو کندھوں پر مزید لپیٹ لیا۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے اپنے کمرے کے کونے میں لگی آرام دہ کرسی پر بیٹھی باہر لان میں گرتے ہوئے زرد پتوں کو دیکھ رہی تھی۔

عنبرین، جس کی عمر اب چھبیس سال کے قریب تھی، اپنی ہم عمر لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ جہاں اس کی عمر کی لڑکیاں شادی، ملبوسات اور خوابوں کی دنیا میں مگن رہتی ہیں، وہاں عنبرین کی آنکھوں میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ اور سنجیدگی تھی۔

اس کے سامنے میز پر ایک ڈائری کھلی تھی، جس کے سفید صفحے پر صرف تین الفاظ لکھے تھے: ”زندگی اور ہم۔“

”کیا واقعی ہم زندگی کو جیتے ہیں، یا زندگی ہمیں صرف گزار دیتی ہے؟“ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے قلم کو گھماتے ہوئے سوچا۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنا اس کی زندگی کا سب سے بڑا سفر تھا۔

عنبرین ایک ایسے روایتی مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جہاں لڑکیوں کی تعلیم کو صرف ایک ”اچھا رشتہ“ حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن عنبرین کے خواب مختلف تھے۔ وہ پڑھنا چاہتی تھی، اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی اور معاشرے میں اپنی ایک الگ پہچان بنانا چاہتی تھی۔

جب اس نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا، تو اسے لگا کہ اب اس کے راستے کھل جائیں گے۔ لیکن ٹھیک اسی وقت، اس کے والد پر فالج کا حملہ ہوا اور گھر کا پورا نظام درہم برہم ہو گیا۔ بڑا بھائی اپنی الگ دنیا میں مست تھا، اور ماں بوڑھی ہو چکی تھی۔

ایسے میں، عنبرین نے اپنے ایم فل (M.Phil) کا داخلہ فارم دراز میں بند کر دیا اور ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرار کی نوکری کر لی۔ یہ اس کا پہلا قدم تھا جہاں اس نے اپنے خوابوں کی قربانی دے کر ”فرض“ کا راستہ چنا تھا۔

کالج کا ماحول متحرک تھا، لڑکیوں کے قہقہے اور ان کی معصوم باتیں ہر طرف گونجتی تھیں۔ عنبرین جب کلاس روم میں داخل ہوتی، تو وہ ایک بہترین استاد ہوتی، لیکن اسٹاف روم میں وہ ہمیشہ تنہا اور خاموش رہتی۔

اس کے ساتھ کام کرنے والی دوسری خواتین اکثر شاپنگ، جیولری اور خاندانی مسائل پر گفتگو کرتیں، لیکن عنبرین ان سب سے دور اپنے نوٹس تیار کرتی رہتی۔

کچھ اسے ”مغرور“ کہتے اور کچھ ”سخت مزاج“۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس خاموشی کے پیچھے کتنے طوفان چھپے ہیں۔ وہ ہر ماہ اپنی پوری تنخواہ ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتی، والد کی

دوائیاں لاتی اور گھر کا راشن پورا کرتی۔ اس پورے عمل میں، اس کی اپنی ذات کہیں پیچھے چھوٹ گئی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، عنبرین کے سر کے چند بال چاندی کے تاروں میں بدلنے لگے۔ اب محلے داروں اور رشتہ داروں کی ہمدردیاں زہر آلود ہونے لگی تھیں۔

”عنبرین بیٹا! عمر نکلتی جا رہی ہے، اب کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر شادی کر لو، کب تک اس طرح اکیلی رہو گی؟“ ایک چچی نے شادی کی تقریب میں سب کے سامنے کہا۔

عنبرین نے مسکرا کر جواب دیا، ”چچی جان! اگر میں شادی کر کے چلی گئی، تو میرے بیمار ابا کا خیال کون رکھے گا؟“

ان کا جواب تھا، ”لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں، انہیں ایک نہ ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔ بھائی سنبھال لے گا سب۔“ وہ بھائی جو مہینے میں ایک بار بھی باپ کا حال پوچھنے نہیں آتا تھا! عنبرین نے اس دن جان لیا کہ یہ معاشرہ لڑکی کو صرف ایک کردار میں دیکھنا چاہتا ہے، اس کی قربانیوں کی یہاں کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

ایک دن، کالج سے واپسی پر شدید بارش شروع ہو گئی۔ عنبرین نے ایک پرانے بس اسٹاپ کے شیڈ تلے پناہ لی۔ وہاں پہلے سے ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی، جو مٹی کے دیے بیچ رہی تھی تاکہ بارش میں بھی کچھ کما سکے۔

عنبرین نے اس عورت کو دیکھا، اس کے چہرے پر تھکن تو تھی لیکن بے بسی نہیں تھی۔ عنبرین نے اس سے کچھ دیے خریدے اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”اماں! اس عمر میں اتنی محنت؟ آپ کے بچے کہاں ہیں؟“ عنبرین نے پوچھا۔

بوڑھی عورت نے اپنی چمکدار آنکھوں سے اسے دیکھا اور بولی، ”بیٹی! بچے اپنے گھروں کے ہو گئے۔ یہ مٹی کے دیے ہی میرا سہارا ہیں۔ جب تک ہاتھ پیر چلتے ہیں، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گی۔ زندگی نے مجھے یہی سکھایا ہے کہ عورت اگر خوددار ہو، تو وہ کبھی یتیم یا بے سہارا نہیں ہوتی۔“

اماں کی باتوں نے عنبرین کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ حالات کے جبر کا رونا رو کر اپنی زندگی ضائع کر رہی ہے۔ اگر زندگی نے اسے ایک سخت راستے پر کھڑا کیا ہے، تو وہ اس راستے کو اپنی طاقت کیوں نہ بنا لے؟

اس نے رونا اور کڑھنا چھوڑ دیا۔ اس نے شام کے وقت ایک ادبی رسالے کے لیے آرٹیکلز لکھنا شروع کیے۔ اس کی تحریریں عورت کے روایتی مظلوم کردار کے خلاف تھیں، وہ لڑکیوں کو خود اعتمادی اور تعلیم کی اہمیت سکھاتی تھیں۔

اس کے الفاظ میں ایسا جادو اور سچائی تھی کہ پڑھنے والی لڑکیاں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ صرف ایک ٹیچر نہیں رہی تھی، بلکہ وہ سینکڑوں لڑکیوں کے لیے ایک رول ماڈل بنتی جا رہی تھی۔

دو سال مزید گزر گئے۔ عنبرین کی محنت رنگ لانے لگی۔ اس کے مضامین کی ایک کتاب شائع ہوئی جس کا عنوان تھا "خاموشی کا شور"۔ یہ کتاب معاشرے میں لڑکیوں کے حقوق اور ان کی نفسیات پر ایک شاہکار ثابت ہوئی۔

اسی دوران، اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ عنبرین بہت روئی، لیکن یہ آنسو پچھتاوے کے نہیں تھے، کیونکہ اس نے آخری سانس تک اپنے والد کی وہ خدمت کی تھی جو شاید کوئی بیٹا بھی نہ کر پاتا۔

اب وہ گھر میں اپنی ماں کے ساتھ اکیلی تھی، لیکن اب اس کے پاس ایک مقصد تھا۔ اس نے اپنے گھر کے ایک حصے میں غریب لڑکیوں کے لیے ایک مفت لرننگ سینٹر کھولا، جہاں وہ انہیں پڑھانے کے ساتھ ساتھ مختلف ہنر بھی سکھاتی تھی۔

ایک شام، اس کی ایک پرانی سہیلی اس سے ملنے آئی۔ وہ شادی شدہ تھی اور اپنے گھریلو جھگڑوں اور زندگی کی بے رنگی کا رونا رو رہی تھی۔ اس نے عنبرین کے پرسکون چہرے کو دیکھا اور کہا، "عنبرین! میں سوچتی تھی کہ تم نے شادی نہیں کی، تم تنہا ہو، شاید تم ناخوش ہو۔ لیکن آج تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ سب سے زیادہ پرسکون تم ہی ہو۔"

عنبرین نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا: "سحر! سکون کسی انسان یا کسی رشتے سے نہیں ملتا، یہ ہمارے اندر سے آتا ہے۔ جب ہم یہ قبول کر لیتے ہیں کہ زندگی ہمارے مطابق نہیں، بلکہ ہمیں زندگی کے مطابق خود کو ڈھالنا ہے، تو سارے گلے ختم ہو جاتے ہیں۔ میں اکیلی ضرور ہوں، لیکن تنہا نہیں ہوں۔ یہ لڑکیاں، میری کتابیں، اور میرا ضمیر؛ یہ سب میرے ساتھ ہیں۔"

عنبرین کو اس کی ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں حکومت کی طرف سے ایک معزز ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا۔ یہ اس لڑکی کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا جسے کبھی معاشرہ "بوجھ" اور "ناکام" سمجھ رہا تھا۔

تقریب کے دن، وہ ایک سادہ لیکن باوقار سفید لباس اور نیلی شال اوڑھے ہال میں داخل ہوئی۔ اس کی ماں وہیں وہیل چیئر پر بیٹھی فخر سے اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔

جب عنبرین کا نام پکارا گیا، تو پورا ہال تالیوں کی گونج سے لرز اٹھا۔ وہ اسٹیج پر گئی، اس نے اپنا ایوارڈ وصول کیا اور مائیک کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

ہال میں موجود تمام نظریں اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ عنبرین نے گہرا سانس لیا اور بولنا شروع کیا:

"لوگ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی کی زندگی تب ہی مکمل ہوتی ہے جب اسے کوئی سہارا مل جائے۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ خدا نے عورت کو خود ایک سہارا بنا کر پیدا کیا ہے۔ زندگی ہمیں توڑتی ہے، ہمارے خواب چھینتی ہے، ہمیں دو راہے پر کھڑا کرتی ہے، لیکن یہ سب اس لیے ہوتا ہے تاکہ ہم اپنی اصل طاقت کو پہچان سکیں۔"

اس نے اپنی ڈائری کا وہ جملہ دہرایا:

"زندگی اور ہم... دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ اگر آپ کے پاس ایک مضبوط ارادہ اور پاکیزہ ضمیر ہے، تو آپ زندگی کے ہر طوفان کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ میں نے زندگی سے سمجھوتا نہیں کیا، میں نے زندگی کو جی کر دکھایا ہے۔"

ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔

عنبرین نے کھڑکی سے باہر دیکھا، جہاں رات کے اندھیرے کو چیرتی ہوئی اسٹریٹ لائٹ کی روشنی اب زرد نہیں، بلکہ ایک روشن مستقبل کا راستہ دکھا رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر اپنی ڈائری بند کر دی، کیونکہ اب اس کی زندگی کا ہر صفحہ مکمل ہو چکا تھا۔

فرشتوں کو بھی میسر نہیں شاعر ہونا

ڈاکٹر جاوید کمال
(حیدرآباد۔ہندوستان)

چنو بھائی کے سر پر آج کل ایک نیا بھوت سوار تھا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کیا بھوت بھی نئے پرانے ہوتے ہیں۔؟ کیوں نہیں! جب تعلقات نئے پرانے ہوسکتے ہیں دوستوں کو نئے اور پُرانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، بیگمات نئی اور پرانی ہوسکتی ہیں تو بھوت نیا اور پرانا کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہم بھوت کو نیا اس لئے کہہ رہے ہیں کہ چنو بھائی کے سر سے پرانا بھوت اتر چکا تھا۔ اب ایک نیا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ پرانا بھوت کون تھا؟ کتنے دن وہ چنو بھائی کے سر پر سوار رہا یہ ایک لمبی داستان ہے۔

ہاں تو بات ہورہی تھی کہ چنو بھائی کے سر پر آج کل ایک نیا بھوت سوار تھا۔ اس سے پہلے جو بھوت اُن کے سر پر سوار تھے اُن میں ایف ایم حسین کی طرح مصور بننے کا بھوت، ویراٹ کوہلی کی طرح بیٹس مین بننے، محمد علی کلے کی طرح باکسر بننے اور شاہ رخ جیسا ایکٹر بننے کا بھوت شامل تھے۔

چنو بھائی نے رات کے تین بجے فون کر کے جگا دیا۔ ہم نے نیم خوابیدہ آنکھوں سے فون کے اسکرین پر نظر ڈالی تو چنو بھائی کا نام دیکھ کر ہمارے دل کی دھڑکنوں نے رفتار پکڑلی۔ یا اللہ اسوقت چنو بھائی کا فون! ”خدا نخواستہ چنو بھائی نے داعی اجل کو لبیک تو نہیں کہہ دیا۔“ یہ خیال اس لئے ہمارے ذہن میں آیا کیونکہ عام طور پر نیک لوگ صبح صبح ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملتے ہیں، جب کہ ہم جیسے گنہگار بے سر پیر کے خوابوں کا لطف لے رہے ہوتے ہیں۔

”ہیلو ہیلو“ کی آواز مسلسل فون سے نکل کر ہماری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

ہم نے ”السلام علیکم“ کہا اور اطمینان کی سانس لی کہ چنو بھائی حیات ہیں۔ ہم نے اُن سے شکایتاً اتنی رات گئے فون کرنے کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے بغیر کسی تمہید کے فوراً ہی کہا کہ ”میں شاعر بننا چاہتا ہوں“۔ لا حول ولا قوۃ۔ ہم سمجھ گئے کہ چنو بھائی کے سر پر شاعری کا بھوت سوار ہوگیا ہے۔

یہ بھوت حضرات بھی ملک الموت ہی کی طرح خاموشی سے آتے ہیں اور سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔

”تو میں کیا کروں؟ خوامخواہ میری نیند خراب کردی تم نے۔“ ہم نے کسی قدر ناراضگی سے کہا تو چنو بھائی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”ارے ناراض کیوں ہوتے ہو دوست، تم

ہی تو میرے سچے دوست ہو جس سے میں ہمیشہ مشورہ کیا کرتا ہوں" چنو بھائی نے ہمیں سچا دوست بتا کر سارا غصہ کافور کر دیا۔ اور ہم آنکھیں ملتے ہوئے بستر سے اٹھ بیٹھے اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔" وہ تو ٹھیک ہے چنو بھائی، لیکن یہ مشورہ آپ کل دن میں بھی تو کر سکتے تھے۔ نیند سے جگا کر مشورہ کرنا یہ کہاں کی دوستی ہے؟"

"کیا کروں یار؟ جیسے ہی میرے ذہن میں شاعری کرنے کا خیال آیا۔ نیند مجھ سے کوسوں دور چلی گئی۔"

" ذرا سوچئے چنو بھائی، شاعر بننے کے خیال سے آپ کی نیند کوسوں دور چلی گئی، جب شاعری کرنے لگیں گے تو مستقل بے خوابی کا شکار ہو جائینگے اور دن کے قیمتی اوقات میں الّوؤں کی طرح اونگھتے اور دیدے گھماتے ہوئے گزار دینگے۔"

"کیا کروں یار، میں اپنے سر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔" چنو بھائی نے بڑے ہی صاف گوئی سے کہہ دیا۔

"لیکن چنو بھائی شاعری کرنے کے خیال کی اچانک آمد کیسے ہو گئی؟" ہم نے تعجب سے سوال کیا۔

" ارے دوست بات دراصل یہ ہے کہ کل میرے سالے نے ایک مشاعرہ میں لے جا کر بٹھا دیا۔ بعض شاعروں کی تک بندی اور متشاعروں کا کلام سن کر مجھے لگا کہ اس سے اچھی شاعری تو میں بھی کر سکتا ہوں، میں نے اس کا ذکر سالے صاحب سے کیا تو انہوں نے فوراً ہی استاد سخن سے مجھے ملوا دیا۔

" ملوا دیا نہیں مروا دیا کہئے چنو بھائی،" ہم نے طنز کیا۔

" ارے تم سنو تو سہی، استاد سخن اُس مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے۔"

" چنو بھائی، سالے نے آپ کی بربادی کا سامان کر دیا۔ اپنی بہن کا تو خیال کیا ہوتا"۔ ہمارے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" چنو بھائی نے ناراضگی ظاہر کی۔

ہم سمجھ گئے کہ اب یہ شاعری کا بھوت اتنی آسانی سے چنو بھائی کا پیچھا نہیں چھوڑے گا کیونکہ شاعری کا چکر لا متناہی ہوتا ہے۔

"تو پھر"؟ ہم نے سوال کیا۔" پھر کیا استاد سخن نے ہماری حوصلہ افزائی فرمائی اور کہا کہ آپ کچھ بھی لکھ کر لائیے میں اُسے غزل کا روپ دیدوں گا اور آپ پورے اعتماد کے ساتھ مشاعروں میں دھوم مچا سکتے ہیں۔"

انہوں نے یہ بھی کہا کہ شہر بھر میں اُن کے سینکڑوں شاگرد ہیں جو نام اور پیسہ دونوں کما رہے ہیں"۔ چنو بھائی نے استاد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر؟" آپ کے سالے نے کیا مشورہ دیا؟ ہم نے پوچھا۔ سالے نے استاد سخن سے ذرا دور لے جا کر میری پیٹھ تھپتھپائی اور کہا کہ آپ خوش قسمت ہیں بھائی جان کہ استاد سخن نے آپ کو اپنا شاگرد بنانا منظور کر لیا ہے۔ آپ فوراً پانچ سو روپئے لفافے میں رکھ کر نذرانہ پیش کر دیجئے اور اُن کے آگے زانوئے ادب تہہ کر دیجئے۔ اور یہ بھی تاکید کی کہ جب بھی استاد کوئی غزل یا نظم کی تصحیح کریں یا لکھ کر دیں تو انہیں نذرانہ پیش کرنا نہ بھولیں۔

" اچھا تو کیا فیصلہ کیا آپ نے............"

ہم نے مایوسانہ انداز میں پوچھا۔ کیونکہ ہم جانتے تھے کہ سالا، نہ صرف اپنے بہنوی بلکہ بہن کی زندگی بھی برباد کرنے جا رہا ہے۔ جس آدمی کو قافیہ اور ردیف کی دُم نہیں معلوم، غزل اور نظم میں جو فرق نہیں کر سکتا، غالبؔ کو قصیدہ کا اور اقبالؔ کو مرثیہ کا شاعر سمجھتا ہے اب وہ ممتاز شاعر بن کر لوگوں کا وقت برباد کرنے جا رہا ہے۔"تو چنو بھائی جب آپ نے اور آپ کے سالے نے طے کر ہی لیا ہے کہ آپ شاعر بنیں گے تو ضرور بنیئے۔ شہر میں آج کل ہر دن ایک دو لوگ شاعر بنتے ہی رہتے ہیں۔ اُن میں ایک اور کا اضافہ ہو جائیگا، استاد کا خرچہ پانی بھی چلتا رہیگا اور آپ کے جراثیم بھی پنپتے رہیں گے" یہ کہکر ہم نے چنو بھائی کی بکواس سنے بغیر فون کٹ کر دیا اور لاحول پڑھتے ہوئے دوسری طرف کروٹ بدل کر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

☆☆☆

گرمیوں کی تعطیلات میں ماؤنٹ آبو جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ سارے بچے بہت پرجوش تھے۔ گوگل کے ذریعہ وہاں کی معلومات اکٹھی کی جا رہی تھیں۔

"صفّان بھائی یہ تو اراولی پہاڑ پر واقع ہے اور اس کی سب سے اونچی بلندی "گرو شکھر" کہلاتی ہے"، نعمان نے اپنی قابلیت جتائی۔

حمّاد بھی کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔

"پتا ہے وہاں ایک خوبصورت نکّی جھیل بھی ہے۔"

"اچھا پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔ ہم بوٹنگ کریں گے"، امان، ایان، یزدان نے خوش ہو کر کہا۔

"اور پتا ہے گرمیوں میں گورنر صاحب اپنا پورا عملہ وہاں لے جاتے ہیں اور سرکاری کام وہیں سے انجام دیتے ہیں"، اقصیٰ نے مزید معلومات میں اضافہ کیا۔

"جین مذہب کا دیلواڑا مندر بھی وہیں ہے"، وجیہہ بولی۔

اقصیٰ، حمانہ، آنیہ، اشیا، وجیہہ بھی ایکسائیٹڈ ہو گئیں۔

جب محسن پھوپھا صاحب نے اپنے دوست کے بنگلے میں ٹھہرنے کا انتظام کیا اور وہاں کے متعلق بتانے لگے تو سب ان کے قریب کھسک آئے۔

"دیکھو بچّو ہم ماؤنٹ آبو سے تقریباً ۸ کلومیٹر دور "اوریاں" گاؤں کی پہاڑی پر واقع ایک بنگلے میں قیام کریں گے۔ لیکن سب ضروری ہدایتیں سن لو۔ آس پاس جنگل ہے اس لئے وہاں پر ریچھ بہت پائے جاتے ہیں۔ اور بھی جنگلی جانوروں کا خطرہ ہے اس لئے کوئی بھی رات کو بنگلے سے باہر نہیں نکلے گا۔"

سارے بچّوں کے چہرے سفید پڑ گئے۔

"پھوپھا صاحب دیکھئے یہ سب ڈر گئے۔ میں تو نہیں ڈرتا"، بلّو نے شیخی بگھاری۔

"اوہ ہو آیا بڑا بہادر، رات کو پیشاب کرنے کے لئے تو امّی کو جگاتا ہے۔"

سارے بچّے اس کا مزاق اڑانے لگے۔

"میں بھی نہیں ڈرتا"، نعمان نے کہا

"آہا ہاسٹل میں رو رو کر کس نے برا حال کیا تھا۔"

"وہ تو مجھے امی ابّو کی یاد آ رہی تھی۔"

اب بچّوں میں ڈر بھی تھا اور تجسّس بھی۔

دو Innova گاڑیوں میں سب افراد فجر کے بعد روانہ ہوئے۔ راستے بھر خاموش تھے۔ سروہی کے بعد ہرے بھرے پہاڑ اور گھنے درخت نظر آئے۔ جب ماؤنٹ آبو کی پہاڑی کے گھماؤ دار راستوں پر گاڑی چڑھنے لگی تو بندروں کے غول کے غول دیکھ کر بچے بہت خوش ہوئے۔ لیکن نیچے گہری کھائیوں کو دیکھ کر خون بھی خشک ہو رہا تھا۔ اور دیواروں پر ریچھ کے فوٹو کے نیچے ساودھان کے بورڈ لگے تھے۔ بچے خود بہ خود آیت الکرسی کا ورد کرنے لگے۔

راستہ میں ایک مزار کے پاس گاڑیاں روکی گئیں۔ سیڑھیاں چڑھ کر مرد اور بچے فاتحہ پڑھ آئے۔ اتنے میں خواتین نے سائیڈ میں ایک پیڑ کی چھاؤں میں چٹائی بچھا کر کھانا لگا دیا۔ سب بھوکے تھے۔ جیسے ہی کھانا شروع کیا۔ آس پاس بندر آ گئے۔ انھیں بھی پراٹھے کباب دے کر بھگایا۔

"ارے یہ کیا کیا! اب تو اور زیادہ بندر آئیں گے"، پھوپھا صاحب جو کئی مرتبہ آ چکے تھے انھوں نے بندروں کو پاس میں پڑی لکڑی سے بھگاتے ہوئے کہا۔

"چلو جلدی کھانا ختم کرو اور گاڑی میں بیٹھو" ابو نے کہا۔ لیکن بچوں کو بندر دیکھ کر بہت مزا آ رہا تھا۔ وہ خود کم اور بندروں کو زیادہ کھلا رہے تھے۔

آنیہ آگے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ابو گاڑی اسٹارٹ کر ہی رہے تھے کہ پلک جھپکتے ہی ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی میں سے ایک بندر آیا اور آنیہ کے ہاتھ میں سے نمکین کی تھیلی چھین کر دوسری طرف سے نکل گیا۔ سب ہکّا بکّا رہ گئے۔ پھر تو وہ قہقہہ پڑا کہ گاڑی گل و گلزار ہو گئی۔

ماؤنٹ آبو شروع ہوتے ہی بل کھاتی صاف شفاف سڑکیں، کناروں پر آم اور جامن کے پیڑ، رنگ برنگے پھولوں نے ماحول کو رنگین بنا دیا تھا۔ خوشنما پھول، پھولوں جیسے رنگ برنگے سیّاح۔

"اوریاں" گاؤں کی چوکی سے ہی پہاڑی پر بنا بنگلہ شان سے کھڑا نظر آ رہا تھا۔ لوکیشن دیکھ کر سب کا دل خوش ہو گیا۔

گاڑیوں سے سامان اتارا گیا۔ لال سیڑھیاں چڑھ کر اوپری منزل پر بنے کمروں کی کھڑکیوں سے جب باہر کا نظارہ کیا تو کچھ دوری پر تالاب، سبز پوش پہاڑیاں اور کچھ بنگلے، بہت خوبصورت سماں تھا۔ سامنے خوبصورت برآمدے میں وہاں کے نوکر سانگ سنگھ نے چائے ناشتہ لگا دیا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سب نکّی جھیل گھومنے چلے گئے۔ مال روڈ پر بہت رونق تھی۔ نکّی جھیل پر بوٹنگ ہو رہی تھی۔ سب نے بوٹنگ کا لطف لیا۔ آئس کریم کھائی، بھٹے کھائے۔ رنگ برنگے راجستھانی گھاگھرا چنری اوڑھ کر لڑکیوں نے فوٹو کھنچوائے تو لڑکے بھی کہاں کم پڑنے والے تھے انھوں نے بھی دھوتی کرتا، صافہ پہن کر نقلی مونچھیں لگا اتراتے ہوئے فوٹو کھنچائیں۔ بچّوں کا یہاں سے جانے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن پھوپھا صاحب نے جب کہا کہ زیادہ رات میں جنگلی جانوروں کا خطرہ ہے تو سب جلدی جلدی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔

"دیکھ ایان وہ پینتھر آیا"، صفّان نے ڈراتے ہوئے کہا" دیکھا تو کتّا سامنے سے گزر رہا تھا۔ سب نے قہقہہ لگایا۔

بڑے کمروں میں لگے بیڈ پر دراز ہو گئے اور بچّے لاؤنج میں لگے گدّوں پر بیٹھ کر "اونو" کھیلنے لگے۔

نوکر سانگ سنگھ نے کہا۔

"میں نیچے جا رہا ہوں، اب ہم صبح ہی ملیں گے۔ اندر سے دروازہ بند کر لو۔ کوئی بھی دروازہ کھٹکھٹائے بالکل مت کھولنا۔" بچّوں کے تاش کھیلتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔

محسن پھوپھا صاحب نے دروازہ بند کیا اور بچّوں کو سختی سے ہدایت دے کر کمرے میں چلے گئے۔ جہاں بڑوں کی محفل جمی تھی۔

"یار یزدان مجھے تو نیند نہیں آئے گی"

”ہاں یار“سبھی بچّوں نے کورس میں کہا۔

” یار تم لوگ تو بہت ڈرپوک ہو۔ اتنی سیڑھیاں چڑھ کر تو بھالو آ نہیں سکتا۔ مجھے تو ڈر نہیں لگ رہا ہے“، بلّو نے پھر شیخی بگھاری۔

” یار میں تو کل ڈیڈی سے کہوں گا نیچے نکّی جھیل کے قریب ہی ہوٹل میں کمرہ لے لیں“، ایان نے کہا۔

” ڈرپوک ۔ ڈرپوک“۔ بلّو نے مزاق اڑایا۔

رات کو بارش کی جھنکار اور ہوا کی رفتار کی تیز آواز نے ماحول کو پر اسرار بنا دیا۔ ذرا سی کھڑکی ہلتی تو سب ڈر جاتے۔سب تھکے ہوئے تھے نیند کی دیوی پلکوں پر جھولنے لگی۔

”سن امان لائٹ جلی رہنے دے“، وجیہہ نے کہا۔

” ہاں، میں نے پڑھا تھا روشنی دیکھ کر جنگلی جانور قریب نہیں آتے ہیں“، آنیہ اور اشیا نے بھی اپنا گیان بانٹا۔

کچھ ہی دیر میں عجیب سی غرّانے اور پھنکارنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ڈر کے مارے سب کی بولتی بند ہوگئ۔

عجیب سی آواز سن کر پھوپھا صاحب، ابّو اور چاچو لاؤنج میں آگئے۔ انھوں نے کھڑکی کا ذرا سا پردہ ہٹایا تو سامنے کا منظر بہت ہیبتناک تھا۔

نیچے سومنگ پول کے کنارے ایک ریچھ برسات میں نہا رہا تھا۔بجلی کی کڑک میں اس کا دیوزاد کالا جسم بڑوں بڑوں کے پسینے بہا رہا تھا۔ سب خاموش تھے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بچّوں نے بھی ایک نظر دیکھا اور ڈر کر اپنی ماؤں کے آنچل میں چھپ گئے۔

ایک گھنٹے تک وہ ریچھ جھوم جھوم کر نہاتا رہا،غرّاتا رہا اور سب کے خون خشک کرتا رہا۔

محسن کو سانگ سنگھ پر غصّہ آرہا تھا کہ اس نے صدر دروازہ بند کیوں نہیں کیا۔

لیکن سب نے دیکھا کہ وہ باؤنڈری وال کے قریب ایک پیڑ پر چڑا اور وہاں پر بنے مدھو مکھّی کا چھتّا جو کہ اس کی مرغوب غذا ہے اسے نوش فرمایا اور دیوار پر چڑ کر جنگل کی طرف روانہ ہوگیا۔سب کی جان میں جان آئ۔

سب سونے کی کوشش کرنے لگے لیکن وہ ہیبتناک جسم سامنے آجاتا۔

اچانک ایک کمبل ہلنے لگا اس میں سے دبی دبی چیخوں کی آواز آنے لگی۔ دیکھا تو بلّو کی ڈر کے مارے چیخیں نکل رہی تھیں اور اسے بخار چڑھ گیا تھا۔

” بلّو آنکھیں کھولو لو داوائ لو“، امّی نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

بلّو نے آنکھیں ہی نہیں کھولیں۔ امّی نے زبردستی اس کے منہ میں گولی ڈالی اور پانی پلایا۔

دسرے دن کی صبح بہت چمکیلی تھی۔لیکن بچّوں نے اب بلّو کی خوب کھنچائ کی۔

” بلّو ڈرپوک، بلّو ڈرپوک“

” میں ڈرا نہیں تھا۔ وہ تو برسات میں بھیگنے سے میرے دماغ میں بخار چڑھ گیا تھا۔ اگر وہ آج بھی آجائے نہ تو میں اس سے آنکھیں ملاؤنگا“ہو، ہو سب ہنسنے لگے۔

چھت پر سب کھیل رہے تھے کہ اقصٰی نے کہا۔

” بلّو دیکھو وہ سامنے والی پہاڑی پر بھالو“

دوسرے ہی پل بلّو نے چھلاگ لگائ اور سیدھا امّی کی آغوش میں۔

سب نے پھر کورس میں کہا” بلّو بہادر“

☆☆☆☆☆

غزلیں

شاہین فصیح ربانی

نرم سی بیل سہارا تو نہیں ہو سکتی
یعنی دیوار کا تکیہ تو نہیں ہو سکتی

زندگی کھیل تماشا تو نہیں ہو سکتی
یہ ہوا خواہِ دنیا تو نہیں ہو سکتی

یہ الگ بات کہ وہ اپنے تئیں اپنا لے
بے وفائی اسے زیبا تو نہیں ہو سکتی

خود فریبی اسے کہیے کہ شرارت کہیے
رکھ کے مے سامنے توبہ تو نہیں ہو سکتی

نیند سے خواب کا رشتہ تو سمجھ آتا ہے
اس سے تعبیر بھی پیدا تو نہیں ہو سکتی

اچھی ہو سکتی ہے دنیا بھی یقیناً لیکن
مہرباں ماں سے زیادہ تو نہیں ہو سکتی

دل میں پھوٹا ہے کوئی چشمۂ آلام فصیح
آنکھ بیکار میں دریا تو نہیں ہو سکتی

طاہر سعود کرت پوری

پرانے زخم پر جگنو صفت آنسو بہاتا ہوں
میں سوکھے پھول پر بیٹھی ہوئی تتلی اُڑاتا ہوں

تری خوشبو سے سارا گھر بھرا رہتا ہے آٹھوں پہر
کہ تیری یاد کا لوبان میں اتنا جلاتا ہوں

مرا بچپن مرے نزدیک آ کر بیٹھ جاتا ہے
میں جب ماں باپ کے پیروں میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں

کہیں خوشیوں کو لگ جائے نظر، اس خوف سے اکثر
میں پیشانی پہ اک تل کی طرح اُلجھن سجاتا ہوں

حقیقت کی طرف اک روز دنیا لوٹ آئے گی
اسی امید پر اب تک بھی اصلی گھی بناتا ہوں

وہ میری احتیاطوں کو تکبر نام دیتے ہیں
میں اپنے آپ کا آئینہ گرنے سے بچاتا ہوں

ابھی کچھ مائیں ہیں جو صبح کو قرآن پڑھتی ہیں
اگر کچھ دور کا سوچوں تو طاہرؔ سہم جاتا ہوں

تاشفین سید

(جدہ)

سپردِ باد کریں ہم چراغِ جاں کب تک
بھلا یونہی کریں ہم خود کو رائگاں کب تک

ہمیں سے سیکھ لیں پتھر نچوڑنے کا ہنر
تلاشِ آب میں بھٹکیں گے تشنگاں کب تک

یہ بادِ عمر، شکستہ یہ بادبانِ حیات
رہیں گی موجِ مسائل بھی بدگماں کب تک

کریں گے ہم ہی یہاں روشنی کی کوئی سبیل
جلے گا خون، اٹھے گا یونہی دھواں کب تک

مکین لوٹ کے صدیوں کے بعد آئیں گے
اس انتظار میں رہتے بھلا مکاں کب تک

یہ کاروانِ جنوں خیز ہیں ازل سے رواں
تلاشِ منزلِ مقصود میں رواں کب تک

کھلیں گے صحنِ تمنا میں پھول کب یارب
اڑے گی خاک یہاں میرے مہرباں کب تک

غزلیں

ارشد قدوائی

(جدہ)

ہر اک سے بے خبر دنیا سے بیگانہ بنایا ہے
تری آنکھوں نے مجھکو تیرا دیوانہ بنایا ہے

بظاہر تم نے اپنے کو گدایانہ بنایا ہے
مگر ہستی نے تم کو پھر بھی شاہانہ بنایا ہے

سبو، ساغر، صراحی، جام و پیمانہ بنایا ہے
ترے پیکر نے تجھ کو پورا میخانہ بنایا ہے

جہان دل میں اے لوگو، ذرا سا جھانک کر دیکھو
اسی میں اس نے کعبہ اور بت خانہ بنایا ہے

بڑے عرصے سہی ہے صبر سے جور و جفا تیری
تب ہی دل میں ترے اپنے لئے خانہ بنایا ہے

یہ سچ ہے کے بہت الجھے ہوئے ہیں آپ کے گیسو
مگر میں نے انہی کے واسطے شانہ بنایا ہے

کہا سب نے جو گذری مجھ پہ آخر داستاں سن کر
یہ سچ ہو ہی نہیں سکتی یہ افسانہ بنایا ہے

یہ لگتا ہے وہ ہے شرمندہ ہم سے بے رخی کر کے
تب ہی نظریں جھکیں ہیں منہ پشیمانہ بنایا ہے

حسن امام فدائی

(ہزاری باغ۔جھارکھنڈ)

جو نہاں رکھتا ہوں دل میں وہ عیاں کرتا ہوں میں
دردِ دل ہی ہر سرِ محفل بیان کرتا ہوں میں

سننے والا غور سے جب سن رہا ہے کیا کروں
مختصر قصّے کو اکثر داستاں کرتا ہوں میں

میں اکیلا ہی سفر کرتا ہوں میلوں میل کا
اپنی ماں کی ہر دعا کو سائباں کرتا ہوں میں

سچ میں ہوتی ہے ملاوٹ کچھ نہ کچھ تو جھوٹ کی
جب یقیں ہوتا نہیں تو پھر گماں کرتا ہوں میں

میری فطرت میں نہیں ہے چاپلوسی کی صفت
جب جہاں جیسا کیا ویسا وہاں کرتا ہوں میں

میں اکیلا ہی نکل جاتا ہوں سرحد کے لئے
کب کسی کو اپنا میرِ کارواں کرتا ہوں میں

بھانپ لیتا ہوں سمندر کی خموشی جب حسنؔ
اپنی کشتی پھر سمندر میں رواں کرتا ہوں میں

ظہیر آتش

ہر ایک موڑ پہ رسوا شباب ہوتا ہے
وفا نبھانا بھی یارو عذاب ہوتا ہے

میں دل کی بات کہوں ان سے کس طرح آخر
کہ ان کے چہرے پہ اکثر نقاب ہوتا ہے

اداس آتا ہے اس در سے نامہ بر اکثر
مرے لیے یہی خط کا جواب ہوتا ہے

کچھ اس طرح ہے مرے گھر کی آبرو تم سے
کہ جیسے باغ کی زینت گلاب ہوتا ہے

اندھیری شب سے نہ گھبراؤ تم کبھی" آتش"
اندھیری شب میں چھپا آفتاب ہوتا ہے

اردو زبان کی ترویج و ترقی

مولوی عبدالحق کی خدمات کے تناظر میں

مقسط احمد (مہاراشٹر)

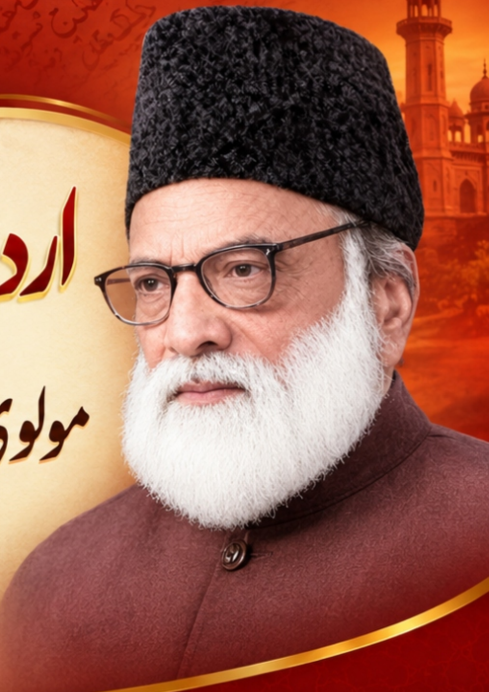

زبان کسی بھی قوم کی تہذیبی شناخت، فکری میراث اور اجتماعی شعور کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ انسان اپنے جذبات، خیالات، تجربات اور احساسات کو جس وسیلے سے دوسروں تک پہنچاتا ہے، وہ زبان ہے۔ زبان صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں ایک قوم کی تاریخ، تہذیب، روایات، اقدار، علمی سرمایہ اور اجتماعی حافظہ محفوظ ہوتا ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر لسانی اور کثیر تہذیبی ملک میں اردو زبان نے مختلف تہذیبوں اور زبانوں کے درمیان رابطے کا ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو نے صدیوں کے سفر میں اپنے دامن میں بسے ہوئے گہوارہ کو وسیع کیا اور مختلف زبانوں کے الفاظ، محاورات اور اسالیب کو اپنے اندر سمو کر ایک دل نشیں، شیریں اور جامع زبان کی حیثیت اختیار کی۔

اردو زبان کی تاریخ دراصل ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور گنگا جمنی ثقافت کی تاریخ سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ اس زبان کی تشکیل و ترقی میں فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت، ہندی، پنجابی، مراٹھی اور دیگر مقامی زبانوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں ایک طرف عربی و فارسی کا علمی و ادبی سرمایہ موجود ہے تو دوسری طرف ہندوستانی تہذیب اور مقامی زندگی کی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے۔

اردو نے ایک طویل تاریخی سفر طے کیا ہے۔ ابتدا میں یہ مختلف علاقوں اور طبقوں کے درمیان رابطے کی زبان کے طور پر استعمال ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں ادبی اظہار کی صلاحیت پیدا ہوئی اور شعراء و ادبا نے اسے اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

اردو شاعری کے میدان میں ولی دکنی کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے بعد میر تقی میر، مرزا غالب، مومن، ذوق، اقبال اور

دیگر عظیم شعرا نے اردو شاعری کو بلندیوں تک پہنچایا۔ نثر کے میدان میں سرسید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، شبلی نعمانی، پریم چند اور دیگر ادیبوں نے اردو کو علمی، اصلاحی اور سماجی موضوعات کے اظہار کی مؤثر زبان بنایا۔

اردو صحافت نے بھی اس زبان کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اخبارات اور رسائل کے ذریعے اردو نہ صرف عوام تک پہنچی بلکہ سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی شعور بیدار کرنے کا وسیلہ بھی بنی۔ اردو کے رسائل نے نئی نسل میں مطالعے کا ذوق پیدا کیا اور ادبی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔

واردو زبان کی ترویج و ترقی کی تاریخ مولوی عبدالحق کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ مولوی عبدالحق کو بجا طور پر "بابائے اردو" کہا جاتا ہے۔ وہ ایک عظیم ماہرِ لسانیات، محقق، ماہرِ تعلیم، ادیب اور اردو کے بے لوث خادم تھے۔

مولوی عبدالحق 20 اپریل 1870ء کو ہاپوڑ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اردو زبان و ادب کی خدمت میں صرف کیا۔ انہیں اردو سے غیر معمولی محبت تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اردو کو تعلیم، تحقیق، صحافت اور علمی و ادبی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ فروغ حاصل ہو۔

مولوی عبدالحق کی سب سے نمایاں خدمات میں انجمن ترقیِ اردو کا کردار قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے اردو کے فروغ کے لیے اس ادارے کو ایک مضبوط علمی و ادبی مرکز بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی کوششوں سے اردو کی کتابیں شائع ہوئیں، علمی مواد مرتب ہوا، لغات اور تحقیقی کاموں کو فروغ ملا اور اردو کے لیے ایک منظم علمی ماحول پیدا ہوا۔

انہوں نے اردو کو محض شاعری اور ادب کی زبان سمجھنے کے بجائے اسے تعلیم، سائنس، تحقیق اور جدید علوم کی زبان بنانے پر زور دیا۔ ان کا خیال تھا کہ کسی زبان کی حقیقی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب وہ نئی نسل کی تعلیم اور جدید علمی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

مولوی عبدالحق نے اردو کے قدیم ذخیرے کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی جدید ضرورتوں پر بھی توجہ دی۔ انہوں نے اردو کی لغت، قواعد، املا اور ادبی سرمایہ کے سلسلے میں قابلِ قدر کام کیا۔ ان کی علمی کوششوں نے اردو کے محققین اور طلبہ کے لیے نئے راستے کھولے۔

اردو کی ترویج کا سب سے مؤثر ذریعہ تعلیم ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں معیاری تعلیم کے ساتھ اردو زبان و ادب کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ طلبہ کو اردو میں جدید سائنسی اور معلوماتی مواد فراہم کیا جائے تو ان میں زبان سے محبت بھی پیدا ہوگی اور علمی صلاحیت بھی بڑھے گی۔

شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، تنقید، تحقیق اور مضمون نگاری اردو ادب کے اہم شعبے ہیں۔ نئی نسل کے قلم کار اردو ادب میں نئے موضوعات شامل کر رہے ہیں۔ بدلتے ہوئے معاشرے، ٹیکنالوجی، ماحولیات، تعلیم، انسانی حقوق اور سماجی مسائل جیسے موضوعات پر اردو میں زیادہ سے زیادہ تخلیقی کام ہونا چاہیے۔

اخبارات، رسائل اور ادبی جرائد نے اردو کی ترویج میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ آج بھی معیاری اردو رسائل نئی نسل میں مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کا مؤثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ رسائل میں طلبہ، اساتذہ اور نوجوان قلم کاروں کو جگہ ملنی چاہیے تاکہ ان کی

تحریری صلاحیتیں پروان چڑھیں۔

آج کا دور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ موبائل فون، کمپیوٹر، سوشل میڈیا، ویب سائٹس اور آن لائن تعلیمی پلیٹ فارم ہماری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ڈیجیٹل دنیا میں بھی اردو کا استعمال بڑھایا جائے۔

آج اردو میں ویب سائٹس، بلاگز، آن لائن اخبارات، تعلیمی ویڈیوز، ای۔کتابیں اور سوشل میڈیا کے صفحات دستیاب ہیں۔ یہ اردو کے لیے ایک نیا اور وسیع میدان ہے۔ اگر ہم جدید ٹیکنالوجی کو اردو کے ساتھ جوڑ دیں تو دنیا کے مختلف حصوں میں موجود اردو داں افراد ایک دوسرے سے آسانی سے جڑ سکتے ہیں۔

دنیا میں ہر روز نئے علمی اور سائنسی نظریات سامنے آ رہے ہیں۔ ان علوم کو اردو میں منتقل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ معیاری ترجمے کے ذریعے اردو میں جدید علم کا بڑا ذخیرہ تیار کیا جاسکتا ہے۔

مولوی عبدالحق کا خواب بھی یہی تھا کہ اردو صرف ماضی کی یادگار نہ رہے بلکہ مستقبل کے علوم کو بیان کرنے والی ایک زندہ اور فعال زبان بنے۔

زبان کی ترقی کے لیے مضبوط لغات اور جدید اصطلاحات بے حد ضروری ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی، کمپیوٹر، طب، قانون، معاشیات اور دیگر علوم کے لیے اردو اصطلاحات کو عام کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں ماہرینِ زبان، اساتذہ اور محققین کو مل کر کام کرنا ہوگا۔

ہماری تہذیبی اور ادبی میراث کا ایک اہم حصہ اردو ہے۔ اس زبان میں ہمارے بزرگوں کی علمی کاوشیں، شعرا کے جذبات، ادیبوں کے افکار اور معاشرے کے تجربات محفوظ ہیں۔ ہماری کلاسیکی شاعری سے لے کر جدید ادب تک ایک وسیع علمی خزانہ اردو میں موجود ہے۔ اردو نے ہمیشہ محبت، اخوت، بھائی چارے، انسانیت اور قومی یکجہتی کا پیغام دیا ہے۔ اس زبان کی شیرینی لطافت، چاشنی، اور وسعتِ قلبی نے مختلف طبقات کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

چیلنجز

آج اردو زبان کو کئی چیلنجز کا سامنا ہے۔ نئی نسل میں مطالعے کی عادت کم ہونا، اردو کی معیاری کتابوں تک محدود رسائی، جدید علوم کے اردو مواد کی کمی، اور زبان کے درست املا و تلفظ سے عدم واقفیت ایسے مسائل ہیں جن پر سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ بعض اوقات اردو کو صرف ادبی یا روایتی زبان سمجھ لیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں جدید ترین موضوعات پر بھی مؤثر انداز میں اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم اردو کو نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں۔

بہرحال اساتذہ کرام کی بات کی جائے تو اردو کی ترقی میں اساتذہ کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ استاد اگر طلبہ میں اردو پڑھنے، لکھنے اور بولنے کا شوق پیدا کرے تو زبان کا مستقبل روشن ہوسکتا ہے۔

اسکولوں میں اردو تقریری مقابلے، مضمون نویسی، خط نویسی، کہانی نویسی، مشاعرے، ادبی کوئز، کتاب خوانی اور دیگر سرگرمیوں کا انعقاد کیا جانا چاہیے۔ طلبہ کو اچھی اردو کتابیں پڑھنے کی ترغیب دی جائے اور ان کی تخلیقی تحریروں کو اسکول کے رسائل اور دیگر ادبی پلیٹ فارم پر شائع کیا جائے۔

اردو کی بقا اور ترقی کا سب سے بڑا تعلق اردو معاشرہ کی نسل سے ہے۔ اگر بچے اردو پڑھیں گے، اردو میں سوچیں گے، اردو لکھیں گے اور جدید ٹیکنالوجی میں اردو استعمال کریں گے تو یہ زبان مزید ترقی کرے گی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بچوں پر اردو مسلط کرنے کے بجائے انہیں اردو کی خوب صورتی اور افادیت سے روشناس کرائیں۔ انہیں اچھی کہانیاں، نظمیں، سوانح، معلوماتی کتابیں اور دلچسپ مضامین پڑھنے کے مواقع فراہم کرائیں۔

اردو کی ترقی صرف حکومت، ادیبوں یا ماہرینِ زبان کی ذمہ داری نہیں بلکہ ہر اردو داں کی ذمہ داری ہے۔ ہم اپنے روزمرہ کے معاملات میں درست اردو استعمال کر سکتے ہیں۔ اردو کتابیں خرید سکتے ہیں، رسائل پڑھ سکتے ہیں، بچوں کو اردو کتابیں تحفے میں دے سکتے ہیں، اردو میں مضامین لکھ سکتے ہیں اور ڈیجیٹل دنیا میں اردو مواد کو فروغ دے سکتے ہیں۔

اگر ہر شخص اپنی سطح پر اردو کے لیے ایک چھوٹا سا قدم اٹھائے تو اجتماعی طور پر ایک بڑی تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔

اختتام

اردو ایک زندہ، توانا، وسیع اور خوب صورت زبان ہے۔ اس کے دامن میں صدیوں کا علمی، ادبی اور تہذیبی سرمایہ موجود ہے۔ ولی دکنی سے لے کر میر و غالب، اقبال سے لے کر فیض اور جدید دور کے بے شمار اہلِ قلم تک اردو نے مسلسل ترقی کی ہے۔

مولوی عبدالحق نے اپنی پوری زندگی اردو کی خدمت کے لیے وقف کر کے یہ ثابت کیا کہ کسی زبان کی ترقی صرف جذباتی وابستگی سے نہیں بلکہ مسلسل محنت، تحقیق، تعلیم، تصنیف، ترجمہ اور عملی اقدامات سے ہوتی ہے۔ ان کی خدمات ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مولوی عبدالحق کے خواب کو آگے بڑھائیں۔ اردو کو جدید علوم، ٹیکنالوجی، تحقیق، تعلیم اور عالمی رابطے کی زبان بنانے کے لیے سنجیدہ کوشش کریں۔

اردو کو صرف ماضی کی عظمت پر فخر کرنے والی زبان نہ بنائیں بلکہ اسے مستقبل کی زبان بنانے کا عزم کریں۔ اردو ہماری زبان ہی نہیں، ہماری تہذیبی شناخت، ہماری ادبی میراث اور ہمارے جذبات کی ترجمان بھی ہے۔ اس کی حفاظت، ترویج اور ترقی دراصل اپنے علمی و تہذیبی ورثے کی حفاظت ہے۔

آیئے عہد کریں کہ ہم اردو پڑھیں گے، اردو لکھیں گے، اردو بولیں گے اور اردو کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے آنے والی نسلوں تک پہنچائیں گے۔ یہی مولوی عبدالحق جیسے اردو کے عظیم خادموں کے لیے حقیقی خراجِ عقیدت ہوگا۔

”زبانیں وہی زندہ رہتی ہیں جنہیں بولنے والے صرف یاد نہیں رکھتے، بلکہ انہیں زندگی کے ہر میدان میں استعمال بھی کرتے ہیں“

بچوں کے ادب میں طنز و مزاح کی روایت

کلدیپ آنند
(نئی دہلی)

لغوی اعتبار سے مزاح کے معنی خوش طبعی، ظرافت اور ایسی دل آویزی کے ہیں جو مسکراہٹ یا ہنسی پیدا کرے، جبکہ طنز سے مراد کسی فرد، رویے یا معاشرتی خرابی پر بالواسطہ، بامعنی اور اصلاحی انداز میں تنقید کرنا ہے۔ جب یہ دونوں عناصر فنکارانہ توازن کے ساتھ یکجا ہو جائیں تو ایسی ادبی تخلیق وجود میں آتی ہے جو قاری کو محظوظ بھی کرتی ہے اور اسے غور وفکر پر بھی آمادہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کی روایت میں مزاح کو ہمیشہ ایک مثبت ادبی قوت سمجھا گیا ہے۔ طنز و مزاح کی حقیقت کو اگر مختصر مگر جامع انداز میں بیان کرنا ہو تو اکبر الہ آبادی کے یہ اشعار اس کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں:

کوٹ اور پتلون جب پہنا تو مسٹر بن گیا
جب کوئی تقریر کی جلسے میں لیڈر بن گیا

بچوں کا ادب ہر معاشرے کی تہذیبی، اخلاقی اور تعلیمی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس ادب کا بنیادی مقصد بچوں کی ذہنی، جذباتی اور تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دینا ہے۔ اسی لیے بچوں کے ادب میں طنز و مزاح کو ایک مؤثر اور دلکش اسلوب کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مزاح بچوں کو محظوظ کرتا ہے، جب کہ طنز ان کی فکری تربیت اور معاشرتی شعور کو بیدار کرتا ہے۔ بچوں کے ادب میں طنز و مزاح کی روایت نہایت قدیم ہے، مگر وقت کے ساتھ اس میں موضوعات اور اندازِ بیان کے اعتبار سے وسعت پیدا ہوئی ہے۔

اگرچہ بچوں کے ادب کا بنیادی مقصد تفریح، تعلیم اور کردار سازی ہے، لیکن ان مقاصد کو دلچسپ اور مؤثر بنانے میں مزاح کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ بچے فطری طور پر ہنسنا، کھیلنا اور خوش رہنا پسند کرتے ہیں، اس لیے ایسا ادب جو انہیں مسکرانے پر مجبور کرے، ان کے ذہن و دل پر زیادہ گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ مزاح کے ذریعے مشکل باتیں بھی آسانی سے بچوں تک پہنچ جاتی ہیں، جب کہ طنز کا استعمال بچوں کے ادب میں نہایت نرم، شائستہ اور اصلاحی انداز میں کیا جاتا ہے تاکہ کسی کی دل آزاری کے بجائے مثبت تربیت ہو۔ مثلاً ایک شعر

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

اردو ادب میں بچوں کے لیے مزاحیہ روایت کی جڑیں بہت پرانی ہیں۔ اس روایت کا ابتدائی سراغ ہمیں امیر خسرو کی پہیلیوں، کہہ مکرنیوں اور لطیف منظومات میں ملتا ہے۔ ان کی مشہور مزاحیہ پہیلی:

”پر جھاڑ کر بانگ دی، سنا سارا گاؤں
امیر خسرو یوں کہیں، اس کے سر پر تھے دو پاؤں“

بچوں کے ادب کی ابتدائی مزاحیہ تخلیقات میں شمار کی جا سکتی ہے۔ اس پہیلی میں سادگی، شگفتگی، تجسس اور ذہنی ورزش کے تمام عناصر موجود ہیں، جو بچے کو محظوظ بھی کرتے ہیں اور سوچنے پر بھی آمادہ کرتے ہیں۔ یہی خصوصیات بعد کے بچوں کے ادب میں بھی نظر آتی ہی۔ اسی طرح اکبر الہ آبادی نے اردو شاعری میں طنز و مزاح کو غیر معمولی مقام عطا کیا۔ ان کا مشہور شعر:

بتاؤں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا

اپنے اندر گہرا طنز اور شگفتگی رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ شعر براہِ راست بچوں کے لیے نہیں کہا گیا، لیکن اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اردو ادب میں مزاح کی روایت کس قدر مضبوط

اور قدیم ہے۔ بعد میں یہی شگفتہ روایت بچوں کے ادب تک پہنچی، جہاں اس کا انداز زیادہ معصوم، لطیف اور اصلاحی ہو گیا۔

ابتدائی دور میں بچوں کے لیے لکھی جانے والی کہانیوں، حکایتوں اور لوک داستانوں میں مزاحیہ عناصر نمایاں تھے۔ جانوروں کی کہانیوں، لطیفوں اور تمثیلی قصوں کے ذریعے بچوں کو اخلاقی اسباق سکھائے جاتے تھے۔ پنچ تنتر، کلیلہ و دمنہ اور الف لیلہ جیسی کلاسیکی کتابوں میں مزاح اور طنز دونوں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

بچوں کے ادب میں بھی طنز و مزاح کی مضبوط روایت موجود ہے۔ مولوی اسماعیل میرٹھی، علامہ اقبال، صوفی تبسم، کرشن چندر، شوکت تھانوی، احمد جمال پاشا، ابن انشاء، نظیر فتحپوری، اشفاق احمد، سراج عظیم، بابو آر کے، انور مرزا صاحب، ستار فیضی صاحب، شوکت پردیسی اور ڈاکٹر حلیمہ فردوس جیسے دیگر ادیبوں نے بچوں کے لئے ایسی تحریریں تخلیق کیں جن میں خوش مزاجی، شگفتگی اور اصلاح کا پہلو نمایاں ہے۔ ان کی کہانیوں اور نظموں میں ہلکے پھلکے مزاح کے ذریعے بچوں کو سچائی، دیانت، محنت، صفائی اور حسنِ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔

ابن انشاء ادب کے عظیم مزاح نگار، شاعر، سفرنامہ نگار اور کالم نویس تھے۔ انہوں نے جس طرح بڑوں کے لیئے اعلیٰ درجے کا مزاح تخلیق کیا، اسی طرح بچوں کے لیئے بھی نہایت دلکش، معصوم اور شگفتہ نظمیں لکھیں۔ ان کی بچوں کی نظموں کا مجموعہ "بلو کا بستہ" اردو ادبِ اطفال کا ایک اہم سرمایہ ہے۔ اس مجموعے کی نظموں میں بچوں کی نفسیات، ان کی زبان، ان کے کھیل اور ان کی دلچسپیوں کو نہایت فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

"منی تیرے دانت کہاں ہیں"؟ ابنِ انشاء کی ایک نہایت مقبول اور مزاحیہ نظم ہے۔ اس نظم میں ایک بچے کے دودھ کے دانت گرنے کے معمولی سے واقعے کو تخیل اور ظرافت کے ذریعے ایک دلچسپ کہانی میں بدل دیا گیا ہے۔ شاعر یہ تصور پیش کرتا ہے کہ منی کے دانت چوہے، بلی اور کتے نے مختلف ضرورتوں کے لیے "ادھار" لے لئے ہیں۔ دانتوں کو ادھار دینے کا یہ تصور بچوں کے لئے نہایت حیرت انگیز اور دلچسپ ہے، جس سے بے ساختہ مزاح پیدا ہوتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی "میلے کی سیر" ایک نہایت دلچسپ اور شوخ نظم ہے۔ اس میں بچے ایک دوسرے کو میلے کی تیاری کا مشورہ دیتے ہیں۔ پھٹے جوتے چمکانے، ٹوپی پر تمغہ لگانے، صابن سے بچنے، پانی سے منہ دھونے اور ہاتھ سے ٹیڑھی مانگ نکالنے جیسے مناظر روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن شاعر نے انہیں اس انداز سے پیش کیا ہے کہ بے اختیار مسکراہٹ لبوں پر آ جاتی ہے۔ یہ مزاح بچوں کی شرارتوں اور ان کی معصوم سوچ سے پیدا ہوتا ہے۔

اسی نظم میں میلے کے مختلف مناظر، جھولا والے کی آواز، حلوائی کی صدائیں اور میلے کی گہما گہمی کو اس قدر جاندار انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قاری خود کو میلے کے ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ مختلف آوازوں اور مکالموں کی شمولیت نظم کو ڈرامائی کیفیت عطا کرتی ہے اور بچوں کی دلچسپی برقرار رکھتی ہے۔

ابن انشاء کی "بلو کا بھالو" میں مزاح کردار نگاری سے پیدا ہوتا ہے۔ بھالو کے قد، پیٹ، ٹوپی، عادتوں اور کھانے پینے کی دلچسپ تصویریں ایک معصوم مزاح پیدا کرتی ہیں۔ شاعر نے مبالغہ اور ہلکی پھلکی شوخی کے ذریعے کردار کو زندہ کر دیا ہے، مگر کہیں بھی تحقیر یا طنز کا احساس نہیں ہوتا۔

اسی طرح ابن انشاء ہی کی نظم "میدو کا طوطا" میں بچوں کی دنیا، ان کے پالتو جانوروں سے محبت اور تخیل کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ طوطے کے رنگ، شکل وصورت اور حرکات کا بیان بچوں کے لیے دلچسپی اور تفریح کا باعث بنتا ہے۔ اس نظم میں منظر نگاری اور لفظی موسیقیت مزاح کو مزید مؤثر بناتی ہے۔ ابنِ انشا کی مزاح نگاری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بچوں کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں آسان الفاظ، رواں بحر، دلکش قافیے، مکالماتی انداز اور گنگنانے کی کیفیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں بچوں کو جلد یاد ہو جاتی ہیں اور ان کے ذہن پر دیر پا اثر چھوڑتی ہیں۔

شوکت پردیسی بنیادی طور پر ایک قادرالکلام شاعر تھے، تاہم انہوں نے بچوں کے ادب میں بھی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ اگرچہ ان کی زندگی میں بچوں کی نظموں کا کوئی مستقل مجموعہ شائع نہیں ہو سکا، لیکن ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزندان نے ان کی ادبی میراث کو محفوظ رکھنے کی قابلِ تحسین کوشش

کی۔ انہوں نے شوکت پردیسی کی بچوں کے لیے لکھی گئی منتشر نظموں کو یکجا کر کے "تحفۂ اطفال" کے نام سے شائع کیا۔

"تحفۂ اطفال" شوکت پردیسی کی بچوں کے لیے تخلیق کردہ نظموں کا مجموعہ ہے، جس میں بچوں کی ذہنی سطح، معصوم جذبات، اخلاقی تربیت اور تعلیمی شعور کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ان نظموں میں سادہ، شیریں اور رواں زبان استعمال کی گئی ہے، تاکہ بچے آسانی سے انہیں سمجھ سکیں اور ان سے لطف اندوز بھی ہوں۔ ساتھ ہی یہ نظمیں بچوں میں اچھے اخلاق، نظم و ضبط، محنت، محبت، وطن دوستی اور انسانی اقدار پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

شوکت پردیسی اردو ادب کے ان ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے ایسی نظمیں تخلیق کیں جن میں تفریح، تعلیم اور اخلاقی تربیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کی مزاح نگاری کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ بچوں کو محض ہنسانے کے لیے مزاح پیدا نہیں کرتے بلکہ شگفتگی کے ذریعے انہیں زندگی کی مفید باتیں سکھاتے ہیں۔ ان کی مزاحیہ شاعری میں زبان کی سادگی، فطری روانی، برجستگی اور بچوں کی نفسیات سے گہری واقفیت نمایاں ہے۔

"انوکھا چورن" شوکت پردیسی کی کامیاب مزاحیہ نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم میں ایک ایسے چورن کا ذکر ہے جسے کھانے کے بعد شاعر کا پیٹ مسلسل بھوکا رہتا ہے۔ وہ دوسروں کے حصے کا کھانا بھی کھا جاتا ہے لیکن پھر بھی اس کی بھوک ختم نہیں ہوتی۔ اس مبالغہ آمیز صورتِ حال سے نہایت دلکش مزاح پیدا ہوتا ہے۔ بچے اس غیر معمولی کیفیت پر ہنستے بھی ہیں اور مبالغے کے حسن سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اسی طرح "جاہل مٹھو" ایک نہایت کامیاب مزاحیہ نظم ہے۔ اس میں ایک طوطے کو اردو اور انگریزی سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر وہ ہر بات کے جواب میں صرف "ٹائیں ٹائیں" کرتا ہے۔ طوطے کی مسلسل بے اعتنائی، روتی کی بے بسی اور آخر میں اسے "جاہل مٹھو" قرار دینا ایک فطری اور معصوم مزاح پیدا کرتا ہے۔ اس نظم میں مزاح کے ساتھ ساتھ بچوں کو تعلیم کی اہمیت اور سیکھنے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا گیا ہے۔ شوکت پردیسی کی مزاح نگاری کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ ان کے یہاں طنز کی تلخی نہیں بلکہ ظرافت کی مٹھاس ملتی ہے۔ ان کے مزاح میں کسی کردار کی تذلیل یا تحقیر نہیں ہوتی بلکہ ہنسی معصوم حالات، دلچسپ کرداروں اور غیر متوقع واقعات سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی انداز بچوں کے ادب کے لیے نہایت موزوں ہے۔

ان کی نظم "حوصلہ" اور "بچوں کی غزل" اگرچہ مزاحیہ نہیں ہیں، لیکن ان سے شوکت پردیسی کی فکری وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان نظموں میں محنت، خود اعتمادی، تعلیم، تہذیب اور اخلاق جیسی اقدار کو نہایت سادہ اور مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کو ادب کا بنیادی مقصد سمجھتے تھے۔ شوکت پردیسی کی مزاحیہ شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بچوں کی زبان میں، بچوں کے لیے اور بچوں کی نفسیات کے مطابق لکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں آسان الفاظ، دلکش مکالمے، موسیقیت، روانی اور ہلکا پھلکا مزاح بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، جبکہ پس منظر میں اخلاقی اور تعلیمی پیغام بھی موجود رہتا ہے۔ مختصراً، "انوکھا چورن" اور "جاہل مٹھو" جیسی نظمیں شوکت پردیسی کی کامیاب مزاح نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان نظموں میں شگفتگی، معصوم مزاح، تخلیقی تخیل، سادہ اسلوب اور اصلاحی شعور کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہی خصوصیات شوکت پردیسی کو اردو ادبِ اطفال کے اہم مزاحیہ شاعروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔

عصرِ حاضر کے ادیبوں میں سراج عظیم کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے متعدد معیاری تخلیقات پیش کی ہیں اور اس میدان میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے ان کی پہلی کتاب دادا بیتی ہے جس میں طنز و مزاح کے مختلف نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ٹیپو کی کہانیاں بھی ان کی اہم تخلیقات میں شمار ہے۔ بچوں کے ادب میں طنز و مزاح کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ طنز کے مقابلے میں ظرافت کو زیادہ موزوں اور مؤثر قرار دیتے ہیں۔ ان کی رائے دراصل بچوں کے ادب کے لیے ایک اصولی رہنمائی کی حیثیت رکھتی ہے۔

راقم سے گفتگو کرتے ہوئے سراج عظیم نے کہا:

"آداب جی کلدیپ! یہ میری پہلی کتاب تھی جس نے مجھے اپنے منفرد نام کی بنا پر بچوں کے ادب میں قائم کیا۔ اس کتاب پر دہلی

اردو اکیڈمی اور بنگال اردو اکیڈمی نے اوّل انعام سے نوازا۔ میرا ماننا ہے کہ جہاں تک طنز کا تعلق ہے، وہ بچوں کے ادب میں نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طنز براہِ راست بیانیہ نہیں ہوتا بلکہ مزاح کے پردے میں اپنا ہدف سامنے لاتا ہے، یعنی کہیں پہ نگاہیں، کہیں پہ نشانہ کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ طنز دراصل قلمکار کی بلند انشاء پردازی، الفاظ کی باریک دروبست اور معنوی گہرائی کا مظہر ہوتا ہے۔ طنز و مزاح کا متوازن امتزاج صرف ایک زیرک اور صاحبِ فن قلمکار ہی عمدگی سے پیش کرسکتا ہے۔ میں بچوں کے ادب میں طنز کے نہ ہونے کی وکالت اس لیے کرتا ہوں کہ اولاً طنز بچوں کے فہم وادراک سے بالاتر چیز ہے۔ ثانیاً اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ بڑی عمر کے بچے طنز کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تب بھی اخلاقی اعتبار سے یہ ان کی تربیت کے لئے مناسب نہیں۔ میرے نزدیک اس سے بچوں میں بے باکی اور منہ پھٹ پن پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، جو کسی حد تک بدتہذیبی کے زمرے میں آتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کے بقول طنز بچوں کی طبیعت پر ایک بھاری صنف ہے، اس لیے اس کے متبادل کے طور پر بچوں کے ادب میں ظرافت و مزاح کی اصطلاح کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ میں بھی ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی اس رائے سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔"

سراج عظیم کی اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے ادب کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ اخلاقی اور ذہنی تربیت کا مؤثر وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بچوں کی نفسیات، عمر اور فکری سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے اسلوب کو اختیار کرنا چاہیے جو ان میں خوش مزاجی، شگفتگی، مثبت فکر اور اخلاقی اقدار کو فروغ دے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طنز کے بجائے ظرافت کو بچوں کے ادب کے لیے زیادہ موزوں قرار دیتے ہیں۔ ان کی یہ رائے عصرِ حاضر میں بچوں کے ادب کی تنقید اور نظری مباحث میں ایک اہم اصولی موقف کی حیثیت رکھتی ہے۔

معاصر اردو ادب، خصوصاً بچوں کے ادب میں سراج عظیم کا نام احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ ان ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے معیاری، بامقصد اور اخلاقی اقدار سے بھرپور ادب تخلیق کرنے کو اپنی ادبی ذمہ داری سمجھا۔ ان کی شخصیت میں سادگی، خلوص، شائستگی اور فکری سنجیدگی نمایاں نظر آتی ہے، جبکہ ان کی تحریروں میں بچوں کی نفسیات، ان کی ذہنی سطح اور تعلیمی و تربیتی تقاضوں کا گہرا شعور جھلکتا ہے۔

ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کی پہلی کتاب "دادا بیتی" کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی اور اسے دہلی اردو اکیڈمی اور بنگال اردو اکیڈمی کی جانب سے اوّل انعام سے نوازا گیا۔ یہ اعزاز نہ صرف ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف ہے بلکہ بچوں کے ادب کے میدان میں ان کی اہمیت کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ بعد میں ٹیپو کی کہانیوں کے نام سے ان کی سیریز آئی۔ سراج عظیم کے نزدیک بچوں کی کہانی صرف تفریح کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ وہ ان کی شخصیت سازی، اخلاقی تربیت اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا ایک مؤثر وسیلہ بھی ہے۔ اسی تناظر میں وہ "ٹیپو کی کہانیاں" لے کر آئے جن کے تحت وہ بچوں کے ادب کی ایک کامیاب اور مؤثر پیش کش قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کہانیوں کا مرکزی کردار "ٹیپو" بچوں کی نفسیات سے ہم آہنگ، متجسس، ذہین اور زندہ دل کردار ہے، جس سے بچے آسانی کے ساتھ ذہنی اور جذباتی رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ ان کہانیوں میں ٹیپو اور ہماری شرارتیں، ٹیپو اور پاگل کھی، برسات اور ٹیپو، ٹیپو کے بازار میں مزے، ٹیپو کی لوری و ٹیپو کی اماں اس میں شامل ہیں۔

"ٹیپو اور حمایت چچا کا ٹھیلا" ایک ایسی یادداشت نما کہانی ہے جس میں مصنف نے اپنے بچپن کے ایک معمولی سے واقعے کو نہایت شگفتہ اور دل آویز انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کہانی کی اصل قوت اس کا فطری مزاح، معصوم شرارتیں، کرداروں کی برجستگی اور دیہی وقصباتی ماحول کی جیتی جاگتی عکاسی ہے۔ پوری کہانی میں قاری مسلسل مسکراہٹ اور ہلکی سی ہنسی کی کیفیت سے دوچار رہتا ہے، لیکن یہ ہنسی کسی کردار کی تضحیک یا تحقیر پر مبنی نہیں بلکہ انسانی فطرت اور بچپن کی معصوم شرارتوں سے پیدا ہوتی ہے۔

اس کہانی کا سب سے نمایاں مزاحیہ کردار ٹیپو ہے۔ وہ اپنی سادہ لوحی، بھولے پن، معصوم حرکات اور بے ساختہ قہقہوں کے باعث قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ جب بچے اسے اپنی شرارت میں شریک کر لیتے ہیں اور وہ حمایت چچا کے ٹھیلے کو بار بار پٹخنے لگتا ہے تو اس کے چہرے پر پھیلی معصوم مسکراہٹ اور بے اختیار ہنسی ایک فطری مزاح پیدا کرتی ہے۔ اس

مزاح کی بنیاد مصنوعی لطیفہ گوئی نہیں بلکہ کردار کی فطری معصومیت ہے۔حمایت چچا کا کردار بھی مزاح پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ان کا روزانہ غصے میں باہر نکلنا، ادھر ادھر دیکھنا، بڑبڑانا اور بچوں کو ڈانٹنا ایک ایسا تکراری منظر ہے جو ہر بار نئے لطف کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یہ تکرار کہانی میں مزاح کی شدت کو بڑھاتی ہے اور قاری کو اگلے منظر کا انتظار رہتا ہے۔کہانی میں مکالمے مزاح کے مؤثر وسیلے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ٹیپو کی مخصوص بول چال، بچوں کی شرارتیں اور حمایت چچا کے غصے سے بھرے جملے منظر کو زندہ کر دیتے ہیں۔ ان مکالموں میں تصنع نہیں بلکہ روزمرہ زندگی کی سادگی اور فطری پن نمایاں ہے،جس کی وجہ سے مزاح خود بخود جنم لیتا ہے۔جہاں تک طنز کا تعلق ہے، اس کہانی میں اس کا عنصر نہایت محدود ہے۔اگرچہ حمایت چچا کی بے بسی اور بچوں کی شرارتوں کے بعض مناظر میں ہلکی سی طنزیہ کیفیت محسوس ہوتی ہے،لیکن اس کا مقصد کسی فرد یا طبقے پر تنقید کرنا نہیں۔ نہ ہی کہانی میں سماجی، سیاسی یا اخلاقی برائیوں پر علامتی یا بالواسطہ حملہ کیا گیا ہے، جو طنز کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس لیے اس کہانی کو طنزیہ افسانہ قرار دینا درست نہیں ہوگا۔درحقیقت یہ کہانی ظرافت کی عمدہ مثال ہے۔ یہاں مزاح کرداروں کی معصوم حرکات، بچپن کی شرارتوں، موقع و محل کی مناسبت، زبان کی برجستگی اور یادداشت کی شیرینی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری ہنستا ضرور ہے مگر کسی کردار کی تذلیل یا تحقیر محسوس نہیں کرتا۔مصنف نے بچپن کی یادوں کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ وہ قاری کو اپنے ماضی کی یادوں میں بھی لے جاتی ہیں۔مختصراً ”ٹیپو اور حمایت چچا کا ٹھیلا“ بچوں کے ادب میں ظرافتی مزاح کی ایک کامیاب مثال ہے۔ اس میں مزاح فطری، بے ساختہ اور کرداروں کی معصوم نفسیات سے جنم لیتا ہے، جبکہ طنز کا عنصر برائے نام ہے۔یہی خوبی اس کہانی کو بچوں کے لیے دلچسپ، دلکش اور تربیتی اعتبار سے بھی موزوں بناتی ہے، کیونکہ یہ ہنسی کے ساتھ محبت، معصومیت، دوستی اور انسانی تعلقات کی لطافت کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

”ٹیپو نے سائیکل چلائی“ ایک ایسی دلچسپ اور شگفتہ کہانی ہے جس میں مزاح کا سرچشمہ کرداروں کی معصوم حرکات، غیر متوقع واقعات اور بچپن کی بے فکری ہے کہانی کا مرکزی کردار ٹیپو اپنی سادہ لوحی، معصومیت اور سائیکل چلانے کے بے حد شوق کی وجہ سے مزاح پیدا کرتا ہے۔جب وہ ضد کر کے سائیکل حاصل کرتا ہے اور پھر اسے سنبھال نہیں پاتا تو یکے بعد دیگرے پیش آنے والے واقعات، جیسے سائیکل کا بے قابو ہونا، مستری نمو کے اڈے میں جا گھسنا، بیل گاڑی، رکشے اور سائیکل سوار کا آپس میں الجھ جانا، ایک نہایت دلچسپ صورتِ حال پیدا کرتے ہیں۔ یہ تمام مناظر مزاحِ موقع (Situational Humour) کی بہترین مثال ہیں۔

کہانی میں کرداری مزاح بھی نمایاں ہے۔ٹیپو کی معصوم گفتگو، اس کی بے چارگی اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش قاری کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ لے آتی ہے۔اسی طرح ارد گرد موجود کرداروں کا ردِ عمل، خصوصاً لالہ کا ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہونا اور مجمع کا اس سارے ہنگامے سے لطف اندوز ہونا، مزاح کو مزید مؤثر بنا دیتا ہے۔

مصنف نے پورے واقعے کو نہایت سادہ، رواں اور بے تکلف انداز میں بیان کیا ہے، جس سے مزاح فطری انداز میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔کہانی میں کسی کردار کی تحقیر یا تذلیل نہیں کی گئی، بلکہ بچپن کی معصوم شرارتوں اور روزمرہ زندگی کے دلچسپ حالات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔”ٹیپو اور حمایت چچا کا ٹھیلا“ اور ”ٹیپو نے سائیکل چلائی“ سراج عظیم کی فنکاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ان کہانیوں میں ٹیپو کا کردار اپنی سادہ لوحی، معصومیت، بے ساختہ حرکات اور بچگانہ جوش کے ذریعے قاری کے دل میں جگہ بنا لیتا ہے۔مصنف نے اس کردار کو اس قدر فطری انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری اس کے ساتھ ہنستا بھی ہے اور اس کے لیے ہمدردی بھی محسوس کرتا ہے۔

بابو آر کے کا اصل نام رحمت اللہ خان ہے۔آپ جولائی 1948ء میں ضلع امراوتی (مہاراشٹر) کے شہر اچلپور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اردو میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی اور تجارت سے وابستہ رہے۔ادبی دنیا میں ”بابو آر کے“ کے قلمی نام سے شہرت پائی۔آپ نے طنز و مزاح، افسانہ، بچوں کے ادب اور شاعری سمیت مختلف اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں ”خطا معاف“، ”ہو بہو“ (طنز و مزاح)، ”الف

سے اونٹ" اور "آؤ سوچیں" (بچوں کی کہانیاں) نمایاں ہیں، جب کہ "بلاشبہ" "باتوں باتوں میں" (طنز و مزاح) اور "ورد کی خوشبو" (افسانے) ان کی تصانیف میں شامل رہی ہیں۔

ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں فکر تونسوی ایوارڈ (غالب کلچرل اکیڈمی، بنگلور) سے نوازا گیا، جبکہ "الف سے اونٹ" کو مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا دوسرا انعام اور "آؤ سوچیں" کو پہلا انعام حاصل ہوا۔ یہ اعزازات ان کی ادبی اہمیت اور فنی وقعت کا واضح ثبوت ہیں۔

بابو آر کے کی مزاح نگاری کا نمایاں وصف شائستگی، لطافت اور اصلاحی شعور ہے۔ ان کے یہاں مزاح محض قہقہہ پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ معاشرتی رویوں، انسانی کمزوریوں اور روزمرہ زندگی کی ناہمواریوں کو خوش اسلوبی سے پیش کرنے کا فن ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز کی کاٹ ضرور موجود ہے، لیکن اس میں تلخی، جارحیت یا ذاتی حملے کا عنصر نہیں ملتا۔ وہ ہنسی کے ذریعے قاری کو سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں، جو ایک کامیاب مزاح نگار کی بنیادی خصوصیت ہے۔

بابو آر کے کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے بچوں کے ادب کو بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مرکز بنایا۔ ان کی کتاب "الف سے اونٹ" بچوں کی نفسیات، زبان اور دلچسپیوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جس میں تفریح، تعلیم، تخیل اور اخلاقی تربیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھتے ہوئے وہ ان کی ذہنی سطح پر اترتے ہیں، ان کی زبان میں بات کرتے ہیں اور ان کے احساسات و جذبات کو نہایت فطری انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مختصراً، بابو آر کے اردو ادب کے ان ممتاز ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے طنز و مزاح اور بچوں کے ادب دونوں میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی مزاح نگاری شگفتگی، فکری بالیدگی، زبان کی سلاست اور اصلاحی مقصدیت کی آئینہ دار ہے، جب کہ بچوں کے ادب میں ان کی خدمات اردو ادب کے ایک اہم اور قابلِ قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

افسانہ "اچھن میاں اور ریل کا سفر" کے تناظر میں بابو آر کے کی مزاح نگاری اور ادبِ اطفال میں ان کی اہمیت

بابو آر کے کا افسانہ "اچھن میاں اور ریل کا سفر" ان کی کامیاب مزاح نگاری اور بچوں کی نفسیات پر گہری نظر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کہانی میں انہوں نے ایک معصوم بچے کے پہلے ریل کے سفر کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ہر واقعہ فطری مزاح سے بھرپور معلوم ہوتا ہے۔ یہ مزاح نہ تو تصنع پر مبنی ہے اور نہ ہی کسی کردار کی تضحیک پر، بلکہ بچوں کی سادہ لوحی، بے ساختگی اور معصوم طرزِ فکر سے جنم لیتا ہے۔

کہانی کا مرکزی کردار اچھن میاں اپنی بھولی بھالی حرکتوں اور معصوم غلط فہمیوں کی وجہ سے قاری کے دل میں جگہ بنا لیتا ہے۔ امام ضامن کو آئس کریم کی قیمت سمجھ لینا، ریلوے اسٹیشن پر موجود تمام لوگوں کو خالہ کی شادی کے مہمان تصور کرنا، ریل کی پٹریوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہونا اور آخر میں اپنے سوٹ کیس کے اوپر رکھے دوسرے سوٹ کیسوں کو ہی اٹھا لینے کی تجویز دینا، یہ تمام واقعات مزاحِ کردار اور مزاحِ موقع کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان مناظر میں قاری ہنستا ضرور ہے، لیکن اچھن میاں کا مذاق نہیں اڑاتا بلکہ ان کی معصومیت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

بابو آر کے کی مزاح نگاری کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ بچوں کی نفسیات کو پوری صداقت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بچے دنیا کو اپنی محدود معلومات اور تخیل کی روشنی میں سمجھتے ہیں، اسی لیے ان سے اس نوع کی غلط فہمیاں سرزد ہوتی ہیں۔ مصنف نے انہی نفسیاتی کیفیات کو کہانی کا بنیادی سرمایہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھن میاں کا کردار مصنوعی نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا بچہ محسوس ہوتا ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ کہانی بابو آر کے کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔ انہوں نے سادہ، رواں، مکالماتی اور بچوں کی سمجھ کے مطابق زبان استعمال کی ہے۔ مکالمے مختصر، برجستہ اور کرداروں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔ مزاح کسی لطیفے یا لفظی بازی گری سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ کرداروں کے اعمال، مکالموں اور غیر متوقع صورتِ حال سے جنم لیتا ہے۔

بابو آر کے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تفریح اور تربیت کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہیں۔ "اچھن میاں اور ریل کا سفر" میں بچے سفر کے آداب، والدین کی رہنمائی کی اہمیت، نظم و ضبط، صبر اور مشاہدے کی عادت جیسے پہلوؤں سے بھی واقف ہوتے ہیں، لیکن یہ تمام باتیں براہِ راست نصیحت کے انداز میں

نہیں بلکہ دلچسپ واقعات کے ذریعے ذہن نشین ہوتی ہیں۔ یہی کامیاب بچوں کے ادب کی بنیادی خصوصیت ہے۔

ادبِ اطفال میں بابو آر کے کی اہمیت اس اعتبار سے بھی مسلم ہے کہ انہوں نے بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جو ان کی ذہنی سطح، دلچسپیوں اور نفسیاتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ ان کی کہانیوں میں معصومیت، شگفتگی، تخیل اور اخلاقی شعور کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ بچوں کو محض ہنسانے کے لیے نہیں لکھتے بلکہ ان کی شخصیت کی مثبت تعمیر کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

مختصراً "اچھن میاں اور ریل کا سفر" بابو آر کے کی مزاح نگاری کا ایک نمائندہ افسانہ ہے، جس میں فطری مزاح، جاندار کردار نگاری، سادہ زبان، برجستہ مکالمے اور بچوں کی نفسیات کی گہری تفہیم نمایاں ہے۔ یہی خصوصیات بابو آر کے کو اردو کے اہم مزاح نگاروں اور بچوں کے ادب کے ممتاز تخلیق کاروں میں نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں بچوں کو مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ زندگی کے چھوٹے چھوٹے آداب بھی سکھاتی ہیں، اسی لیے ان کا ادب تفریح اور تربیت دونوں حوالوں سے یکساں اہمیت رکھتا ہے۔

حلیمہ فردوس معاصر اردو ادب کی ممتاز ادیبہ، محقق، نقاد اور مزاح نگار ہیں۔ انہوں نے ادب کی مختلف اصناف میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور خصوصاً بچوں کے ادب، تحقیق و تنقید، تعلیم و تدریس اور مزاح نگاری کے میدان میں اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ ان کا تعلق ریاست آندھرا پردیش سے ہے اور وہ 25 جنوری 1952ء کو پیدا ہوئیں۔ حلیمہ فردوس نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مزاح نگاری سے کیا۔ ان کی مزاحیہ تحریروں میں شگفتگی، سلاست، سماجی شعور اور اصلاحی فکر کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ انہوں نے زندگی کے معمولی واقعات اور معاشرتی رویوں کو دل چسپ اور فکر انگیز انداز میں پیش کیا، جس کی وجہ سے ان کی مزاح نگاری کو اردو ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ حلیمہ فردوس کو درس و تدریس کے شعبے میں بھی غیر معمولی تجربہ حاصل ہے۔ انہوں نے تقریباً چھتیس برس تدریسی خدمات انجام دیں۔ تدریس سے وابستگی نے ان کی شخصیت میں تحقیقی بصیرت، تعلیمی شعور اور بچوں کی نفسیات سے گہری واقفیت پیدا کی، جس کا اثر ان کی تحریروں میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ حلیمہ فردوس کی تصانیف موضوعات کے تنوع کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی نمایاں کتابوں میں "کاش اللہ" اور "بہر کیف" (طنزیہ و مزاحیہ مضامین)، "تعلیم و تدریس کے نئے تناظر" (تعلیمی مضامین)، "الفاظ کی دنیا" (لسانی کھیل)، "بچوں کی ڈھنگ رنگ دنیا" (بچوں کی کہانیاں)، "ارج" (تحقیقی و تنقیدی مضامین) اور "بچوں کی کہانیاں، خواتین کے قلم سے" (مرتبہ) شامل ہیں۔ ان کے مضامین اور مقالات مختلف معتبر ادبی رسائل میں بھی مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔

ادبی و سماجی سرگرمیوں میں بھی ان کا کردار نمایاں ہے۔ وہ انجمن خوش دلان، کرناٹک کی بانی، صدر اور تاحیات رکن ہیں۔ اس کے علاوہ محفلِ نسا، بنگلور کی ٹرسٹی اور نائب صدر کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ ان تنظیموں کے ذریعے اردو زبان کی ترویج، تدریس اور ادبی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے منظم منصوبوں پر کام کیا جاتا ہے، جبکہ ہر سال فروری میں یومِ اردو بڑے پیمانے پر منایا جاتا ہے۔ حلیمہ فردوس کی شخصیت ایک ہمہ جہت ادیبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے مزاح نگاری، تحقیق، تنقید، تعلیم اور بچوں کے ادب کو یکساں اہمیت دی اور ہر میدان میں اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کا کامیاب اظہار کیا۔ ان کی تحریروں میں علمی سنجیدگی، تخلیقی بصیرت، زبان کی شگفتگی اور اصلاحی شعور نمایاں ہے، جس کی بنا پر وہ معاصر اردو ادب کی اہم اور معتبر ادیباؤں میں شمار کی جاتی ہیں۔

انہوں نے مزاح نگاری اور ادبِ اطفال دونوں میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی مزاح نگاری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہنسی کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں بناتیں بلکہ اس کے ذریعے بچوں کی ذہنی تربیت، سماجی شعور اور اخلاقی اقدار کو بھی فروغ دیتی ہیں۔ ان کا افسانہ "لوٹ کے بدھو گھر کو آیا" اس فن کا بہترین نمونہ ہے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار بدھوا اپنی سادہ لوحی، معصومیت اور بھولے پن کی وجہ سے قاری کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔ گدھوں سے اس کی غیر معمولی دوستی، شہر جا کر ٹریفک انسپکٹر کو جادوگر سمجھ لینا، خود اس کی جگہ

کھڑے ہو کر اشارے دینے کی خواہش ظاہر کرنا اور بعد میں گدھا بیچ کر دولت کمانے کا خواب دیکھنا ایسے واقعات ہیں جو مزاحِ کردار اور مزاحِ موقع کی عمدہ مثالیں ہیں۔ یہ مزاح کسی کی تضحیک یا تحقیر پر مبنی نہیں بلکہ بچے کی معصوم سوچ اور محدود تجربے سے پیدا ہوتا ہے۔

حلیمہ فردوس بچوں کی نفسیات سے گہری واقفیت رکھتی ہیں۔ بدھوا ہر نئی چیز کو اپنے محدود علم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اسی لیے اس کے سوالات اور نتائج بے حد معصوم اور دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ قاری اس کی حرکات پر ہنستا ضرور ہے، مگر اس کی معصومیت سے محبت بھی کرنے لگتا ہے۔ افسانے میں مکالموں کا استعمال نہایت مؤثر ہے۔ بدھوا اور ٹریفک انسپکٹر کے درمیان ہونے والی گفتگو، ماں باپ کی نصیحتیں اور بھیمو چاچا کے جملے مزاح کو فطری انداز میں ابھارتے ہیں۔ زبان سادہ، رواں، محاوراتی اور بچوں کی فہم کے مطابق ہے، جس سے کہانی کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔

حلیمہ فردوس کی مزاح نگاری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مزاح کو اصلاحی مقصد کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ کہانی کے اختتام پر بدھوا اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتا ہے، تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے اور عقل و شعور کی قدر جاننے لگتا ہے۔ اس طرح افسانہ بچوں کو بلاواسطہ یہ پیغام دیتا ہے کہ تعلیم، سمجھ داری اور تجربہ زندگی میں کامیابی کی بنیاد ہیں۔ یہ افسانہ اس حقیقت کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ بچوں کے ادب میں مزاح کا اصل مقصد صرف ہنسانا نہیں بلکہ شخصیت سازی، مثبت سوچ اور بہتر طرزِ عمل کی تربیت بھی ہے۔ حلیمہ فردوس نے اس مقصد کو نہایت کامیابی سے حاصل کیا ہے۔

مختصراً، "لوٹ کے بدھو گھر کو آیا" حلیمہ فردوس کی کامیاب مزاح نگاری کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اس میں فطری ظرافت، جاندار کردار نگاری، سادہ و شگفتہ اسلوب، بچوں کی نفسیات کی گہری آگہی اور اصلاحی فکر کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہی خصوصیات حلیمہ فردوس کو اردو کے بچوں کے ادب اور مزاح نگاری کی اہم اور معتبر تخلیق کاروں میں نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں تتلی اڑی، پیسے اگلتی مشین، کوہ پیمائی کا جنون، میری سہیلی، گھونگے میاں کی شرارت، کلام کو سلام، آج کا کام نہ ٹالو کل پر وغیرہ شامل ہیں۔

بچوں کا ادب بنیادی طور پر تفریح، تعلیم اور کردار سازی کا ادب ہے۔ اس کا مقصد بچوں میں مثبت اقدار، اخلاقی شعور، تخلیقی صلاحیت اور زندگی سے محبت پیدا کرنا ہے۔ اسی لیے بچوں کے ادب میں وہ اصناف اور اسالیب زیادہ مقبول رہے ہیں جو بچوں کی عمر، ذہنی سطح اور نفسیات سے ہم آہنگ ہوں۔ اس تناظر میں اگر طنز کی روایت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادبِ اطفال میں طنز کی روایت کبھی بھی بہت مستحکم یا غالب نہیں رہی۔ اس کے برعکس مزاح، ظرافت، شگفتگی اور معصوم لطافت کو ہمیشہ زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

طنز ایک ایسا ادبی ہتھیار ہے جو معاشرتی، اخلاقی، سیاسی یا سماجی برائیوں پر بالواسطہ انداز میں تنقید کرتا ہے۔ اس میں علامت، کنایہ، اشارہ اور تہہ داری شامل ہوتی ہے، جسے سمجھنے کے لیے فکری پختگی درکار ہوتی ہے۔ چونکہ بچے ابھی ذہنی اور فکری ارتقا کے ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں، اس لیے طنز کی باریکیاں ان کی گرفت میں آسانی سے نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے ادب میں طنز کا استعمال بہت محدود رہا ہے۔ جدید دور میں بچوں کے ادب میں طنز و مزاح کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ اب کہانیوں میں سائنسی ترقی، ماحولیات، موبائل فون، انٹرنیٹ، مصنوعی ذہانت، تعلیمی دباؤ اور سماجی رویوں جیسے موضوعات کو بھی مزاحیہ انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے بچوں میں تنقیدی سوچ، مشاہدے کی صلاحیت اور مسائل کو مثبت انداز میں سمجھنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔

مزاح بچوں کے ادب کو دلچسپ اور پرکشش بناتا ہے۔ مزاحیہ کردار، دلچسپ مکالمے، غیر متوقع واقعات اور لفظی چابک دستی بچوں کی توجہ کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس طرح بچے بغیر کسی بوجھ کے علم و ادب سے وابستہ ہوتے ہیں اور مطالعے کی عادت بھی پروان چڑھتی ہے۔ بچوں کے ادب میں طنز و مزاح کی روایت نہایت اہم اور مؤثر رہی ہے۔ یہ روایت بچوں کی ذہنی نشوونما، اخلاقی تربیت اور تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ ایک کامیاب مزاحیہ اور طنزیہ تحریر وہی ہے جو بچوں کو ہنسانے کے ساتھ ساتھ زندگی کی مثبت اقدار، سماجی شعور اور اچھے اخلاق کی تعلیم بھی دے۔ اسی لیے بچوں کے ادب میں طنز و مزاح آج بھی ایک زندہ، فعال اور مقبول ادبی روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔

افسانوی مجموعہ

''تلخیاں زندگی کی'': ایک طائرانہ نظر

ڈاکٹر سعدیہ سلیم شمسی
(آگرہ)

پروفیسر نسرین بیگم صاحبہ کا افسانوی مجموعہ ''تلخیاں زندگی کی'' اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ کتاب کا سرورق نہایت دیدہ زیب، پُرکشش اور اپنی جانب متوجہ کرنے والا ہے۔ سرورق پر بنی ہوئی ایک آنکھ جیسے بہت سے فسانے بیان کر رہی ہو اور قاری کو کتاب کے اندر چھپی ہوئی کہانیوں کی دنیا میں داخل ہونے کی دعوت دے رہی ہو۔

پروفیسر نسرین بیگم صاحبہ کی ادبی شخصیت صرف افسانہ نگاری تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اپنی شناخت قائم کی ہے۔ ان کی تصانیف میں ''دبستانِ ادب آگرہ کے ممتاز شاعر و ادیب: سید محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی'' (2019)، ''جوش ملیح آبادی کی نثری خدمات'' (2021)، جس پر انہیں اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کی جانب سے انعام سے نوازا گیا، اور ''جوش ملیح آبادی کی شاعری (تنقیدی جائزہ)'' (2023) شامل ہیں۔ ان تصانیف سے ان کے تحقیقی و تنقیدی ذوق، ادبی مطالعے کی وسعت اور اردو ادب سے ان کی گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی علمی پس منظر جب ان کی افسانہ نگاری کے ساتھ ملتا ہے تو ان کی تخلیقی شخصیت کا ایک اور خوب صورت پہلو سامنے آتا ہے۔

کتاب کھولتے ہی سب سے پہلے انتساب پر نظر پڑتی ہے اور خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے۔ اب تک ''آگ کا دریا'' کی مصنفہ محترمہ قرۃ العین حیدر کا نام سنتے اور پڑھتے آئے تھے، لیکن یہاں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ پروفیسر نسرین بیگم صاحبہ نے اپنا پورا افسانوی مجموعہ محترمہ قرۃ العین حیدر کے نام منسوب کیا ہے، جو ان کی استاد بھی رہ چکی ہیں۔ ایسی عظیم استاد کی شاگرد کے بارے میں لب کشائی کرنا یقیناً سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، لیکن پھر بھی چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ذریعے یہ جسارت کر رہی ہوں۔

نسرین صاحبہ سے جب بھی ملاقات کا موقع ملا، انہیں نہایت بااصول، منظم اور اپنے فرائض کے تئیں سنجیدہ پایا۔ ہمارے کالج کے مختلف پروگراموں میں بھی ان سے ملاقات رہی۔ ان کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف جو ہمیشہ محسوس ہوا، وہ وقت کی پابندی ہے۔ وہ وقت کی قدر کرنے والی شخصیت ہیں اور بلاشبہ وقت کی پابندی کامیابی کی ایک بڑی ضمانت ہے۔

جیسے جیسے کتاب کے اوراق پلٹتی گئی، ایک نئی ہی طرز اور ایک مختلف ادبی فضا سے آشنائی ہوتی رہی۔ کتاب کے ابتدائی صفحات ہی میں ایک اور خوب صورت انتساب نظر آتا ہے۔ نسرین صاحبہ نے اپنی مرحومہ والدہ خدیجہ حشمت اللہ کے نام بھی انتساب کیا ہے۔ ماں سے بڑھ کر انسان کی زندگی میں شفقت و محبت کا دوسرا کون سا رشتہ ہو سکتا ہے! اس انتساب کے ساتھ علامہ اقبال کا یہ خوب صورت شعر بھی درج ہے:

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تیری خدمت کے قابل جب ہوا، تو چل بسی

اسی طرح تیسرے صفحے پر شفقت و محبت کی پیکر، استادِ محترمہ پروفیسر ثریا حسین، سابق

صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام انتساب ملتا ہے:

جن کی رہنمائی نے ہماری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

یہ انتسابات خود نسرین صاحبہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے ہمیں روشناس کراتے ہیں۔ ان میں استاد سے عقیدت، ماں سے محبت اور ان شخصیات کے لیے تشکر کا احساس نمایاں ہے جنھوں نے ان کی فکری اور ادبی تربیت میں اپنا کردار ادا کیا۔

اب جب افسانوں کی فہرست پر آتی ہوں تو اکیس افسانوں کا ایک خوب صورت گلدستہ سامنے نظر آتا ہے۔ ہر عنوان جیسے قاری سے کہہ رہا ہو کہ پہلے مجھے پڑھو، پھر دوسرے کی طرف بڑھنا۔ اتنی جلدی پورے مجموعے کے تمام افسانے پڑھ کر ان کا تجزیہ پیش کرنا میرے لیے قدرے مشکل تھا، کیونکہ وقت کی غریب تو میں ہوں ہی اور ذمہ داریاں بھی ایسی ہیں کہ ان سے جان چھڑانا مشکل ہے۔ سو میں نے سوچا کہ کیوں نہ کم از کم اس افسانے کا مطالعہ کر لیا جائے جس کے نام پر پورے مجموعے کا نام رکھا گیا ہے، تاکہ کچھ لکھنے کے لیے تو حاصل ہو!

چنانچہ صفحہ نمبر 83 پر پہنچتے ہی افسانہ ''تلخیاں زندگی کی'' جلوہ گر نظر آتا ہے۔

افسانہ پڑھنے کے بعد یہ احساس شدت سے ابھرتا ہے کہ واقعی انسان کی زندگی میں آنے والی تلخیاں اسے کس طرح اپنے حصار میں جکڑے رکھتی ہیں۔ افسانے کا یہ اقتباس مجھے بہت متاثر کرتا ہے:

”یہ سچ ہے کہ غم انسان کے حصے میں آتا ہے غم کے بغیر خوشی کہاں مگر ایسا بھی تو نہیں ہے مصیبتوں کے سوا خوشی ہو ہی نہیں ... پھر ایسی زندگی سے کیا حاصل غم کے ساتھ خوشی ... بے بسی کے ساتھ کسی کا سہارا بھی ہو... مگر ایسا دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے حصے میں صرف مصیبتوں، تکلیفوں کے کچھ نہیں ہوتا۔“

یہ سطریں پڑھتے ہی غالب کا یہ شعر بے اختیار یاد آتا ہے:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

افسانے کا مرکزی کردار عرفان ہے، جس کے والدین کا سایہ بچپن ہی میں اس کے سر سے اٹھ جاتا ہے۔ اس کی پرورش کی ذمہ داری اس کے چچا اور چچی پر آ پڑتی ہے۔ چچا اپنی ذمہ داری سمجھ کر اسے نبھاتے تو ہیں، لیکن جس شفقت، محبت اور اپنائیت کا احساس ایک بچے کو اپنے والدین سے ملتا ہے، اس کی کمی عرفان کو ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر اپنی ماں کو شدت سے یاد کرتا ہے۔ ماں کی محبت اور ماں کا خوب صورت آنچل اس کی یادوں کا مستقل حصہ بنے رہتے ہیں۔

افسانے کے ذریعے معاشرے کی ان تلخ حقیقتوں کو بھی سامنے لایا گیا ہے جو اب ہمارے گرد و پیش میں عام دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی کبھی انتہائی قریبی رشتے بھی مفاد اور دولت کے سامنے اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ عرفان کی چچی کی نظر بھی اس کی دولت پر مرکوز رہتی ہے، جس سے رشتوں میں چھپی ہوئی خودغرضی کا ایک تلخ پہلو سامنے آتا ہے۔

افسانے کا یہ اقتباس بھی قابلِ غور ہے:

”جب انسان پر مصائب آتے ہیں تو وہ اس کے اندر صبر کرنے کی طاقت دھیرے دھیرے آ جاتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دکھ اور تکلیف سے انسان کے اندر حوصلہ پیدا ہوتا ہے، تبدیلی کے عمل کے لیے مشکلات اور تکلیفوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔“

ان سطروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے زندگی کے تجربات اور انسانی نفسیات کو نہایت سادہ مگر معنی خیز انداز میں پیش کیا ہے۔ جملوں کی ساخت، اسلوب اور بیان میں گہرائی کے ساتھ ساتھ سادگی بھی ہے۔ یہی سادگی افسانے کو عام قاری کے لیے قابلِ فہم بناتی ہے اور قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے۔

اسی طرح چند اور سطریں ملاحظہ ہوں:

”انسان پر جب مصائب آتے ہیں تو اس کی نازک مزاجی باقی نہیں رہتی امنگیں مردہ اورخواہشیں افسردہ ہوجاتی ہیں“

ان سطروں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہم افسانہ ہی نہیں پڑھ رہے بلکہ بیچ بیچ میں زندگی کے تجربات سے کشید کیے گئے اقوالِ زریں کالطف بھی لیتے جارہے ہیں۔

پورے افسانوی مجموعے میں اکیس افسانے شامل ہیں:

حسرتیں، شامِ تنہائی، ادھورے خواب، گردِ یتیمی، گردشِ قسمت، اداس چہرے، کہاں ہے انصاف، کسک، دلِ افسردہ، کاش، آنسو خشک ہوتے ہیں؟، تلخیاں زندگی کی، اور شمع جلتی رہی، آخر کیوں؟، ادھوری نشانی، دلاری، یادِ ماضی، شگفتہ باجی، کہاں ہے وہ قانون، امید کی کرن، آندھی میں جلتا ہوا چراغ۔

یہ اکیس افسانے ایک خوب صورت ادبی گلدستے کی مانند ہیں، جس کی ہر کلی اپنے اندر ایک الگ داستان، ایک الگ احساس اور ایک الگ پیغام لیے ہوئے ہے۔ افسانوں کے عنوانات بھی اس قدر پُرکشش ہیں کہ قاری کے اندر ابتدا ہی سے تجسس پیدا ہونے لگتا ہے کہ آخر اس افسانے میں کون سی کہانی بیان کی گئی ہوگی۔ خصوصاً ''آنسو خشک ہوتے ہیں؟'' اور ''آخر کیوں؟'' جیسے سوالیہ عنوانات قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور وہ افسانہ پڑھ کر ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

مجموعے کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس نمایاں ہوتا ہے کہ تقریباً ہر افسانہ اپنے اندر کوئی نہ کوئی پیغام لیے ہوئے ہے۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی مختلف برائیوں، ناانصافیوں، بدعنوانیوں اور انسانی رشتوں میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کی طرف مصنفہ نے بڑی مصلحت پسندی اور سلیقے سے اشارہ کیا ہے۔ وہ قاری پر کوئی بات مسلط نہیں کرتیں بلکہ کہانی کے بہاؤ میں اسے سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

اس کتاب کا ایک نمایاں اور قابلِ تحسین پہلو زبان کی سادگی اور شگفتگی ہے۔ مصنفہ نے گنجلک اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ زبان عام فہم ہے، اسلوب رواں ہے اور بیان میں ایسی سلاست ہے کہ قاری خود کو افسانوں کے ساتھ بہتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کو ایک ہی نشست میں ختم کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر ''تلخیاں زندگی کی'' ایک ایسا افسانوی مجموعہ ہے جس میں زندگی کے تلخ تجربات، انسانی رشتوں کی نزاکتیں، معاشرتی مسائل، محرومیاں، امیدیں اور انسانی حوصلے مختلف افسانوں کے قالب میں سامنے آتے ہیں۔ نسرین بیگم صاحبہ نے سادہ اور رواں زبان میں زندگی کے ان پہلوؤں کو پیش کیا ہے جن سے ہمارا معاشرہ روزمرہ کی بنیاد پر دوچار ہوتا ہے۔

میری دعا ہے کہ نسرین صاحبہ اسی طرح اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مزید تخلیقات ہمارے سامنے پیش کرتی رہیں اور ہم ان کے ادبی تجربات سے فیض یاب ہوتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے اور اردو ادب کی خدمت کے لیے مزید توفیق عطا فرمائے۔ جدید خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست میں پروفیسر نسرین بیگم صاحبہ کا نام یقیناً قابلِ ذکر ہے، اور امید ہے کہ ان کی تخلیقی کاوشیں اردو افسانے کے دامن کو مزید وسعت عطا کرتی رہیں گی۔

اور ہاں... باقی آئندہ!

کیونکہ اکیس افسانوں کا حساب ایک ہی نشست میں چکانا بھی آخر اتنا آسان نہیں، کچھ افسانے اگلی ملاقات کے لیے بھی تو بچا کر رکھنے چاہیئے۔

☆☆☆☆☆

تبصرۂ کتب

معروف قلمکار و ادیب

محمد اشفاق بدایونی

کی تیسری کتاب

مثال کے طور پر

منظرِ عام پر آگئی ہے۔

بقول مصنف یہ کتاب علوم بلاغت پر ایک جامع اور مکمل تصنیف ہے جو تحقیقی طلباء کے لئے بہترین مددگار ثابت ہوگی۔

بدایونی صاحب ریڈیو پاکستان، کراچی کے معروف براڈکاسٹر رہے ہیں اور اب وہ اپنے ادبی مطالعہ کتابی شکل میں پیش کر رہے ہیں تاکہ طلباء و قارئین ادب اس سے استفادہ کر سکیں۔

اس سے قبل بدایونی صاحب کی دو کتابیں ''یاران نکتہ داں کے لئے'' اور ''عابد اسکوائر'' شائقین سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

محمد عامل عثمانی
(مکہ مکرمہ)

مصنف کا رابطہ نمبر +966591968749

قلم قافلہ

نام: پروفیسر عائشہ محمد طارق شیخ

قلمی نام: عائشہ سمن

جائے پیدائش: مالیگاؤں۔ ضلع ناسک، مہاراشٹر، ہندوستان

رہائش: باندرہ ویسٹ ممبئی، ہندوستان اور دبئی

تعلیم: ایم اے، بی ایڈ، پی ایچ ڈی، MSCIT

پیشہ۔۔۔درس وتدریس

(صدر شعبہ اردو)، انجمن اسلام اکبر پیر بھائی کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس، ممبئی

کوآرڈینیٹر: اردو، عربک ڈپلومہ کورسیس اینڈ اردو لکچرار، جاری کردہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی۔

لکھنے کی ابتدا: گیارھویں جماعت میں... پہلی بار افسانہ لکھا تھا کالج میگزین کے لیے بعنوان" اور شمع جلتی رہی۔"

لکھنا جاری ہے۔ ان میں: نظم، نثر، افسانے، خاکے، غزلیں، داستان، کسی شاعر اور مصنف کے بارے میں تذکرہ شامل ہیں۔ کالج کے زمانے میں خوب ناولیں پڑھی، کبھی ضرورت کے تحت تو کبھی کچھ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے۔ جب جیسا وقت ملا ویسے پڑھ لکھ لیا۔ لکھنے پڑھنے کے شوق نے اب بھی علم وعمل سے جوڑے رکھا ہے۔ پہلی جماعت سے گریجویشن تک گورنمنٹ سے اسکالرشپ ملتی رہی۔

کتابیں:

١. نقرئی کنگن بول اٹھے۔ شعری مجموعہ

٢. شعرستان۔ برائے بیت بازی (حرف حرف آئینہ۔۔شعرستان سیریز)

٣۔ انور خان۔ ایک فنکار

٤۔ بچپن دھنک رنگ سا

٥۔ لفظ سے شعر تک۔ بیت بازی سیریز۔٢

٦۔ متاعِ بیت بازی۔ برائے بیت بازی سیریز۔٣

زیر طباعت:

١۔ چاہتوں کی جھیل میں شعری مجموعہ

اعزازات: ١۔ منترالیہ وارتا سے سماج رتن ایوارڈ

٢۔ لوک نائیک ایوارڈ

٣۔ مہیلا بھوشن ایوارڈ

٤۔ پروین شاکر ایوارڈ، جھانس

٥۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ، لکھنؤ

٦۔ لایف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ، ممبئی

٧۔ اردو ساہتیہ اکیڈمی، ممبئی سے، بیسٹ ٹیچر ایوارڈ

ان کے علاوہ اور کئی مختلف اداروں نے آیوارڈس سے نوزا۔ فلاحی کاموں کے علاوہ تعلیمی میدان میں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ پیپر سیٹنگ، پیپر ایکزامنر، ماڈریٹر اور چیف ماڈریٹر کے فرائض بھی انجام دینے کے مواقع میسّر آئے۔

اشاعت

میرے افسانے، نظمیں، کہانیاں اور رپورٹس ہندوستان کے مؤقر اخباروں و جرائد جیسے بیباک، بانو, ھدا ٹایمز، شاعر، خاتون مشرق، انقلاب، صدائے بسمل, لازوال، باغیچہ۔ اردو ٹایمز، ہندوستان ٹایمز, راشٹریہ سہارا، ایشیا ایکسپریس، گھومتا آئینہ، الحیات وغیرہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

چندہ اشعار

عیش و عشرت کی طرب گاہ میں کب ملتا ہے
عشق جب حد سے فزوں تر ہوتو رب ملتا ہے

میں خوشبو اور جمالِ زندگی سے پیار کرتی ہوں
میں پھولوں سے، کلی سے، روشنی سے پیار کرتی ہوں

مجھے سونے کے اور چاندی کے کنگن کیا دکھاتے ہو
میں کاغذ سے، قلم سے، آگہی سے پیار کرتی ہوں

ساتھ تیرے زندگی چنچل ندی
بن ترے خاموش ہے وہ جھیل سی

لفظوں کی خوشبو، آوازوں کا سفر

آن لائن عالمی خواتین مشاعرہ

ڈاکٹر رفیعہ نوشین۔حیدرآباد

26 اگست 2026 کی وہ خوب صورت شام، جب جشنِ سلیم محی الدین کے ضمن میں منعقدہ آن لائن عالمی خواتین مشاعرے میں شرکت کا موقع ملا، میرے لیے ایک خوش گوار اور یادگار ادبی تجربہ بن گئی۔

یہ مشاعرہ بزمِ تطہیرِ ادب اور ڈاکٹر رفیق زکریا کالج فار ویمن، اورنگ آباد کے زیرِ اہتمام، جب کہ ’’بنات‘‘ کے اشتراک سے منعقد ہوا۔ یہ محض ایک مشاعرہ نہیں تھا، بلکہ اردو شاعری سے وابستہ خواتین کی ایک ایسی بزم تھی جہاں جغرافیائی فاصلے سمٹ گئے اور لفظوں نے دلوں کو قریب کر دیا۔

دہلی، پونہ، کشمیر، حیدرآباد، احمد نگر، کینیڈا، سہارن پور، بیدر، گوا، ممبئی، پنجاب، کولکاتا اور بھوپال سے 17 شاعرات نے شرکت کی اور اپنے منتخب کلام سے اس عالمی ادبی نشست کو سجایا۔

ہر شاعرہ کی آواز میں ایک الگ دنیا تھی۔ کہیں محبت کی نرمی، کہیں زندگی کی تلخ حقیقتیں، کہیں عورت کے احساسات کی گہری ترجمانی اور کہیں لفظوں میں چھپی ہوئی امید کی روشنی۔ یوں محسوس ہوا جیسے مختلف سمتوں سے بہنے والی شعری ندیاں ایک ہی سمندر میں آملی ہوں۔

مجھے بھی اس خوب صورت بزم میں اپنا کلام پیش کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اہلِ ذوق کی محبت، حوصلہ افزائی اور داد و تحسین نے اس شرکت کو میرے لیے مزید یادگار بنا دیا۔

خصوصاً خوشی اس بات کی ہوئی کہ خواتین کی تخلیقی آوازیں اب جغرافیائی حدود کی پابند نہیں رہیں۔ ایک اسکرین کے فاصلے سے سہی، مگر شعر نے وہ قربت پیدا کر دی جو کبھی کبھی روبرو محفلوں میں بھی میسر نہیں آتی۔

شعر کی یہی تو خوبی ہے۔ لفظ چھوٹے ہوتے ہیں، مگر ان میں آباد دنیا بہت بڑی ہوتی ہے۔

اس خوب صورت ادبی کاوش کے لیے بزمِ تطہیرِ ادب، ڈاکٹر رفیق زکریا کالج فار ویمن، اورنگ آباد، اور ’’بنات‘‘ کی پوری ٹیم کو دلی مبارک باد اور تمام شریک شاعرات کو محبت بھری داد۔

ایسی بزمیں اردو زبان و ادب کے لیے امید کی روشن علامت ہیں۔

سیّد اکبرالدین کا تقرر

مرزا محمد نواب۔ جدہ

حکومتِ ہند نے پچھلے ماہ وزارت خارجہ کے سابق ترجمان سید اکبرالدین صاحب کو ریزرو بینک آف انڈیا (RBI) کے سنٹرل بورڈ میں اگلے چار سالوں کے لیے ڈائریکٹر مقرر کیا ہے۔

بنیادی طور پر ریزرو بینک آف انڈیا (RBI) کا سنٹرل بورڈ آف ڈائریکٹرز بینک کے امور کی مجموعی نگرانی، انتظام اور پالیسی سازی کی سمت طے کرتا ہے۔ اکبرالدین صاحب کا تقرر اس طرح ان کی لیاقت وصلاحیت کا ایک طرح سے اعتراف ہے۔

اکبرالدین صاحب ایک کامیاب سفارت کار بھی رہے ہیں۔ جدہ میں بطور ہندوستانی کونسل جنرل 2000ء سے 2004ء تک ان کی پوسٹنگ تھی۔ اس سے قبل وہ 1988ء سے 1992ء تک ریاض میں فرسٹ سیکریٹری کے طور پر فرائض انجام دے چکے تھے۔

1985 بیچ کے IFS اکبرالدین صاحب اقوام متحدہ (UN) اور اقوامی اٹامک ایزجی ایجنسی، ویانا، میں ہندوستان کے مستقل نمائندے اور وزارتِ خارجہ ہند کے ترجمان بھی رہ چکے ہیں۔

موصوف سے یہاں بہت اچھی ملاقات تھی۔ ہم صحافی برادری کے کچھ لوگوں نے (مرحوم محمد طارق غازی صاحب، سابق مینیجنگ ایڈیٹر سعودی گزٹ، عرب نیوز کے موجودہ مینیجنگ ایڈیٹر سراج وہاب صاحب اور خاکسار) ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کے تحت ہم ہفتہ میں ایک دن اکبرالدین صاحب کے دفتر میں آدھ پون گھنٹہ کے لئے ملتے تھے اور ہندو بیرون ہند تعلقات پر گفتگو وتبادلہ خیال کرتے تھے۔

جدہ میں بطور ہندوستانی کونسل جنرل ہمارے پڑوسی پاکستان کے سفارتکاروں سے بالخصوص ادبی تعلقات کی ایک پہل اکبرالدین صاحب کی تعیناتی کے دورانیہ کا سنہرا باب ہے۔ تاریخ اس وقت لکھی گئی جب اس وقت کے پاکستانی کونسل جنرل مسعود حسن صاحب نے ہندوستانی قنصل خانے کے زیر اہتمام ہونے والے سالانہ مشاعرہ کا افتتاح اکبرالدین صاحب کے ساتھ انٹرنیشنل انڈین اسکول، جدہ میں کیا اور روایتی چراغ دونوں نے مل کر روشن کیا۔

اکبرالدین صاحب کے دور میں ہی قنصل خانہ کے کمپاؤنڈ میں علامہ اقبال کے پوتے، فنکار و بیرسٹر اقبال آزاد، نے سرتال و آواز کی محفل سجائی اور رات گئے تک سامعین کو مسحور کئے رکھا۔

سراج وہاب صاحب کے بقول اکبرالدین صاحب ایک unifier ہیں۔

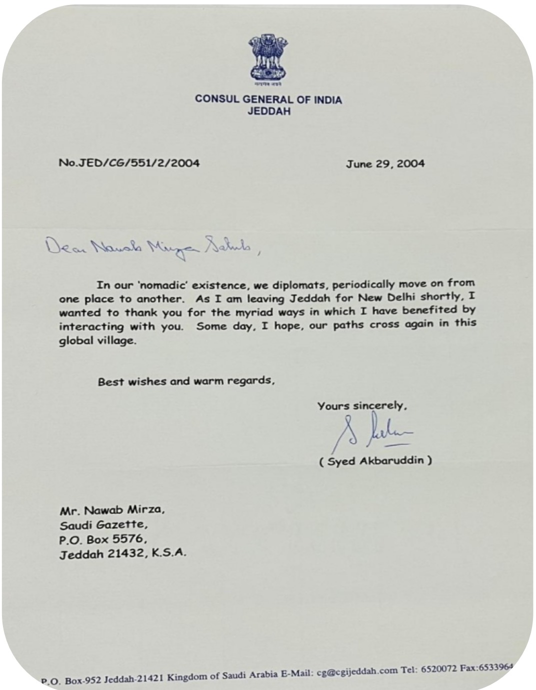

CONSUL GENERAL OF INDIA
JEDDAH

No.JED/CG/551/2/2004 June 29, 2004

Dear Nawab Mirza Sahib,

In our 'nomadic' existence, we diplomats, periodically move on from one place to another. As I am leaving Jeddah for New Delhi shortly, I wanted to thank you for the myriad ways in which I have benefited by interacting with you. Some day, I hope, our paths cross again in this global village.

Best wishes and warm regards,

Yours sincerely,

(Syed Akbaruddin)

Mr. Nawab Mirza,
Saudi Gazette,
P.O. Box 5576,
Jeddah 21432, K.S.A.

P.O. Box-952 Jeddah-21421 Kingdom of Saudi Arabia E-Mail: cg@cgijeddah.com Tel: 6520072 Fax:6533964

سیّد اکبرالدین

2004 میں جدہ میں بحیثیت کونسل جنرل دورانیہ ختم ہوتے وقت انھوں مجھے خط لکھ کر میرا شکریہ ادا کیا اور پنڈت جواہرلال نہرو پر لکھی Judith M. Brown کی سوانح Nehru- A Political Life کا ایک نسخہ بطور تحفہ دیا۔

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ حیدرآباد کی کوتلیا اسکول آف پبلک پالیسی (Kautilya School of Public Policy) میں بحیثیت ڈین مامور ہوئے۔

حال ہی میں عرصہ سے جدہ میں مقیم ان کے کالج کے ایک جونیئر جناب صفی اللہ محمد صاحب سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تو پرانی یادوں کی تجدید ہوئی۔

اکبرالدین صاحب کو ہم تمام کی نیک خواہشات۔

مہتاب صاحب کو کارنامۂ حیات ایوارڈ

جشنِ آزادی مشاعرہ جدہ میں جو یوپی فورم اور قونصل خانہ ہند کے باہمی تعاون سے ۲۸ ؍اگست کو منعقد کیا گیا،
مہتاب قدر (مدیرِ اعلیٰ پندرہ روزہ ''اُردو گلبن'' جدہ)، کو کارنامۂ حیات یادگار ایوارڈ سے قونصل جنزل کے ہاتھوں نوازا گیا،
ساتھ صدر یوپی فورم جناب نورالدین خان بھی شریک رہے۔ (ادارہ)

یہ ہے کامیابی

اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والی حنا قاسم پھول پنکر کی کامیابی

ہندوستان کے کوکن کے خطے کی حنا قاسم پھول پنکر نے کامیابی کی ایک نئی مثال قائم کی۔ اردو سے تعلیم حاصل کر کے پہلے ڈاکٹر، پھر ایکسائز افسر اور اب ڈی ایس پی!

حنا قاسم کا تعلق مہاراشٹر کے کوکن کے ایک چھوٹے سے گاؤں سائی سے ہے اور انکی یہ شاندار کامیابی انکی اپنی محنت اور مستقل مزاجی کا ثبوت ہے۔

حنا قاسم نے اردو میڈیم سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر کی تعلیم مکمل کی، پھر سرکاری ملازمت حاصل کر کے تقریباً سات سال تک ایکسائز محکمہ میں انسپکٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اب

مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں

کامیابی حاصل کر کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس/ اسسٹنٹ کمشنر آف پولیس جیسے باوقار عہدے کے لیے منتخب ہوئی ہیں۔

ان کی کامیابی اس بات کی روشن مثال ہے کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔ ڈاکٹر حنا قاسم کا سفر خاص طور پر مسلم طالبات کے لیے محنت، خود اعتمادی اور بڑے خواب دیکھنے کا پیغام ہے۔ ادارہ

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

ندیم صاحب کا انتقال

اردو گلبن کے ذریعے سابق کونسل جنرل جناب سید محمد یسین ندیم صاحب کے انتقال کی رُوح فرسا خبر ملی۔

''زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے''

مرحوم ایک نکتہ دان انسان ہونے کے ساتھ ساتھ باصلاحیت اور نہایت ذمہ دار افسر تھے۔ انھوں نے اپنی نجی ذمہ داریوں کو کبھی دفتری ذمہ داریوں پر ترجیح نہیں۔

۱۹۹۱ء میں جب وہ جدہ میں کونسل جنرل تھے تو حجاج کی آمد کے پہلے طیارہ آنے والے دن ہی انھیں ان کی شفیق بہن کی رحلت کی روح فرسا خبر ملی۔ لیکن انھوں نے حجاج کے استقبال کو ترجیح دی اور حجاج کو خوش آمدید کہنے کے بعد وہ ہندوستان روانہ ہوئے عزیز بہن کی تدفین میں شریک ہونے کے لئے۔ یہ خبر کسی طرح ہفت روزہ بلٹز کو ہوئی اور بلٹز نے ان کے اس اقدام کو خوب سراہا۔ اردو بلٹز کے ۳۱ اگست ۱۹۹۱ کے صفحہ ۵ کا تراشہ حاضر ہے۔

شہید احمد (جدہ)

کاش ہمارے دیش میں سارے افسران ایسے ہو جاتے!

یٰسین ندیم

یٰسین ندیم نے نہ صرف یہ کہ حاجیوں کا استقبال کیا بلکہ ان کی شکایتیں وغیرہ سنتے رہے اور حتی الامکان ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے رہے بلکہ انہوں نے اپنی ہمشیرہ کی موت کو بالکل صیغۂ راز میں رکھا۔ اپنا نجی غم انہوں نے اپنے تک ہی محدود رکھا۔ صرف اتفاق سے قونصل خانے کے جن دو افسران کو خبر لگ گئی تھی انہیں بھی اس بات کو راز رکھنے کو کہا۔

اپنے فرائض سے سبکدوش ہوتے کے بعد وہ شام کو مع خاندان دلی روانہ ہوئے اور اپنی بہن کے جلوس جنازہ میں شرکت کی فیروزہ سے پہلے ان کی دو بہنیں بھی انہیں داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ مرحومہ ان کی محبت کا آخری اثاثہ تھیں۔

خدا کسی کسی کو یہ وصف عطا کرتا ہے کہ وہ شدید غم میں بھی صبر کا دامن تھامے رکھے اور اپنے نجی غم کو اپنی ذات تک محدود رکھے تاکہ وہ اس کے فرائض کی ادائیگی میں کسی طور حارج نہ ہو۔ خدا کے ایسے ہی منتخب بندوں میں سعودی عرب میں ہندوستانی قونصل جنرل یٰسین ندیم بھی شامل ہیں

وہ وقت یٰسین ندیم کے صبر کی آزمائش کا وقت تھا جب بدھ ۱۵ مئی کو عازمین حج کو لے کر پہلا طیارہ سعودی عرب پہنچنے والا تھا اور روایت کے مطابق پہلے طیارے سے آنے والے عازمین حج کا استقبال انہیں کرنا تھا۔ انہیں پہلے ہی خبر مل چکی تھی کہ ادھر دلی میں ان کی بہن مس فیروزہ (۴۵) شدید طور پر علیل ہیں۔ فیروزہ سے وہ بے انتہا محبت کرتے تھے۔ مگر انہوں نے حاجیوں کے استقبال کی روایت کو نظر انداز کر کے فوراً دلی پرواز کرنے کی بجائے شام کی فلائٹ بک کی۔ حاجیوں کے پہلے طیارے کی آمد سے کافی پہلے انہیں یہ اندوہناک خبر موصول ہوئی کہ فیروزہ انتقال کر گئی۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے فرض کو ترجیح دی۔

(Urdu Edition),
17/17-H COWASJI PATEL STREET,
FORT, BOMBAY-1.

اللہ تعالی مرحوم کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین

انتقال پر ملال

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

انتقال پر ملال

شفیع الحق انتقال کر گئے

عزیزی شفیع الحق IPS، سبکدوش آئی جی اور پروفیسر زاہد الحق، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری کے بڑے بھائی کا پچھلے ماہ ۲۸ اگست کو حیدرآباد میں علاج کے دوران انتقال ہوگیا۔ شفیع بے حد مخلص اور منکسر المزاج شخص تھے۔ ان کے مزاج کی سادگی کے سب گرویدہ تھے۔ ان کا اچانک جانا دل دکھا گیا۔

شفیع کی میت آج شام تک ان شاء اللہ پٹنہ آجائے گی اور کل بعد کی نماز جنازہ پٹنہ میں ۲۹ اگست کو جمعہ بعد جج بھون کی مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔

اللہ مغفرت کے ساتھ اپنی رضا نصیب کرے اور لواحقین کو قلبی سکون عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

آپ کے خطوط

۱۔ دو پہلو

اداریہ نویس نعیم جاوید صاحب کا مشورہ کہ رسالہ اُردو گلبن کی قیمت مقرر کریں اور مفت میں تقسیم نہ کریں بروقت ہے اور اُردو گلبن کے منتظمین کو بلا حیل وحجت اسے قبول کر لینا چاہیے۔

نعیم جاوید صاحب نے اپنے اس مشورے کے لئے مدلل دلائل بھی پیش کئے اور مجھے ان سے اتفاق ہے کہ "آج کل اردو رسائل طبعی موت سے کم اور قارئین کی بے حسی سے زیادہ زندہ درگور کیے جاتے ہیں۔" لیکن ان کے اسی جملے نے دوسرا پہلو بھی پیش کر دیا۔

قارئین کی بے حسی کا عالم اب یہ ہے کہ وہ نادانستہ طور پر رسائل کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایک قاری جو خلوص سے رسالہ آن لائن خریدتا ہے وہ اسے اپنے احباب کو "فارورڈ" (forward) کر دیتا ہے اور بھولے احباب اپنے احباب کو۔ اس طرح یہ "فارورڈ" رسالے کی فروخت کو "زندہ درگور" کر دیتی ہے۔ رسالہ "شگوفہ" اور جریدہ "رہنمائے دکن" وغیرہ ہمارے سامنے ہیں اور اس کے شمارے منٹوں میں آن لائن فارورڈ ہو جاتے ہیں۔

ابوفرح (جدہ)

۲۔ "میگزین ذرا طویل ہے"

ا۔ ماشاء اللہ، میگزین ذرا طویل ہے مگر دلچسپ ہے۔

آپ کی کاوشیں دیدہ زیب ہیں۔

ارشد قدوائی (جدہ)

۳۔

پچھلے شمارے کے مشمولات میں وہ تمام تحریریں جو بے حد طویل تھیں اُکتا دینے والی تھیں۔ نہ مفید، نہ معقول، نہ مبین، نہ واضح۔

طویل تحریریں قاری کی سوچ و توجہ کو بکھیر دیتی ہیں اور یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ لکھنے والا کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ تحریر کا پیغام غیر ضروری تفصیل میں غارت ہو جاتا ہے۔ قاری پڑھتے پڑھتے اُکتا جاتا ہے اور اس کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ علاوہ ناشر، پبلشر کا مالی نقصان اپنی جگہ اور ایڈیٹر و تزئین کار کے وقت و محنت کا نقصان الگ۔ نشانے پر زیادہ ایڈیٹر ہوتا ہے جو ان طویل تحریروں کو پڑھتا ہے، ایڈٹ کرتا ہے اور ترمیم و تنسیخ اس کے لئے کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔

افسوس کا مقام ہے کہ نامی گرامی قلمکار بھی اس لعنت سے اپنے آپ کو دُور نہیں رکھ پاتے۔ میں طویل تحریر کا مخالف نہیں ہوں اور نہ مختصر تحریر کا علمبردار۔ وجہ اتنی ہے طویل تحریر طویل ہونے کے باوجود پر اثر ہو سکتی ہے اور کوئی تحریر مختصر ہونے کے باوجود بے اثر۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ لکھنے والے یہ سوچ کر لکھیں کہ انھیں کس حد پڑھا جائے گا۔

انیس احمد صدیقی (ممبئی)

۴۔ علمی حوصلہ افزائی

میری تحریر "اردو کے خاموش چراغ کامل جنیٹوی صاحب کے ساتھ راقمہ کی فکری نشست" کو پندرہ روزہ "اردو گلبن" کے ستمبر کے شمارے میں خصوصی جگہ دے کر آپ نے جس محبت، قدر شناسی اور علمی حوصلہ افزائی کا اظہار فرمایا، اس کے لیے میں تہہ دل سے آپ کی شکرگزار ہوں۔ آپ کی یہ عنایت میرے لیے محض ایک تحریر کی پذیرائی نہیں بلکہ میرے فکری و ادبی سفر کے لیے ایک قیمتی حوصلہ اور اعزاز ہے۔ اہلِ قلم کی ایسی بصیرت افروز سرپرستی اور حوصلہ افزائی ہی قلم کار کے اعتماد کو مہمیز دیتی اور اسے مزید بہتر لکھنے کی تحریک فراہم کرتی ہے۔ اس خصوصی نوازش، محبت اور خلوص کے لیے میں آپ کی بے حد ممنون و متشکر ہے۔ دعا ہے کہ آپ کا قلم اسی طرح علم و ادب کی شمعیں روشن کرتا رہے اور آپ کی ادبی کاوشیں اہلِ ذوق کے لیے ہمیشہ باعثِ رہنمائی و افتخار بنی رہیں۔

یاسمین اختر طوبیٰ (گوجرہ، پاکستان)

۵۔ اچھا لگا۔۔ ماشاء اللہ

ماشاء اللہ بہت خوب بہت خوب اور اس بار کے رسالہ میں میں نے ایک دو افسانے کو پڑھا ماشاء اللہ بہت ہی اچھا لگا اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آمین۔

محمد ابوبکر مونگیر (ہندوستان)